نومبر 58ء

رجسٹر نمبر ایل ۵۳۴۰

جلد ۵۱

عدد ۲

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین


| عدد ۲ | بابت ماہ نومبر ۱۹۵۸ء | جلد ۵۱ |
|---|---|---|




ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اِشارات

"تقدیر میں لکھے ہوئے مصائب کے پیش آنے پر حق تعالیٰ جل جلالہ پر اعتراض کرنا موت ہے دین کی، موت ہے توحید کی اور موت ہے توکل و اخلاص کی۔ قضا و قدر پر شکوہ و شکایت ہوئی تو نہ دین باقی رہا نہ توحید قائم رہی نہ توکل رہا اور نہ اخلاص رہا۔ جس دل میں شمع ایمان فروزاں ہو وہ چون و چرا کرنا جانتا ہی نہیں، وہ تو صرف ہاں کہا کرتا ہے۔ مقدر سے جو بھی تکلیف پیش آئی ہو اس پر راضی ہوتا اور دل سے کہتا ہے کہ ہاں ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک مردِ حق آگاہ نے توحید کے مقتضیات ذہن نشین کرانے ہوئے اپنے رفقا سے کہے تھے۔ اِن چند جملوں میں ایمان باللہ کے تقاضوں کو اس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں۔ اللہ پر توکل ایک ایسی سیرت و کردار کی صورت گری کرتا ہے جس کے اگرچہ بے شمار مظاہر ہیں لیکن اس کی نمایاں صفات صبر اور تسلیم و رضا ہیں۔ ایک مومن جب اپنی زندگی کا واحد سہارا اللہ تعالیٰ کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کی حالت اُس مسافر کی سی ہو جاتی ہے جسے نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہو اور نہ ہی کف بدہن موجیں اُسے ہراساں اور پریشان کرتی ہوں۔ فتح مندیاں اور کامرانیاں جب اس کے قدم چومتی ہیں تو وہ اِتراتا نہیں بلکہ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور اسی طرح جب ناکامیاں اور نامرادیاں اُس کے حصّے میں آتی ہیں تو وہ نوشتۂ ایزدی پر برہم ہونے کی بجائے صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور مالک الملک سے دست بدعا ہوتا ہے کہ وہ حالات کا رُخ پھیر دے۔

اگر اس معاملہ کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ صبر یا تسلیم و رضا ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے توکل علی اللہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص، اپنے خالق اور مالک کا جس قدر زیادہ معتقد ہوگا، اُسی تناسب سے اُس میں تسلیم و رضا موجود ہوگی۔ صبر و ضبط یا تسلیم و رضا اللہ پر توکل کی عملی تعبیر ہے۔ جو چیز عقیدہ کی شکل میں توکل علی اللہ کہلاتی ہے وہی جب انسانی اخلاق میں جلوہ گر ہوتی ہے تو صبر یا تسلیم و رضا نام پاتی ہے۔ یہ صفات انسان کے اندر اُس وقت تک موجود رہیں گی جب تک کہ اُسے اپنے خدا پر یقین اور بھروسہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس چیز پر بے حد زور دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (سورۂ آل عمران - ۲۰۰)

اے ایمان لانے والو! صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (سورۂ بقرہ - ۱۹)

اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں اس حقیقت کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں واضح فرمایا گیا ہے:

عجبا لامرء مومن ان امره کله له خیر ولیس ذالك لاحد الا المومن۔ ان اصابته سراءُ شکر فکان خیرًا وان اصابته ضراء صبر فکان خیرًا (مسلم)

ایمان دار آدمی کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور یہ چیز سوائے اہلِ ایمان کے اور کسی کو میسر نہیں۔ اسے جب خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہے، اور جب اس پر تکلیف یا مصیبت آتی ہے

تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔

---

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام نے صبر و ثبات کو کیوں غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیابی کے مراحل سے گزارنے کے لیے صبر و ضبط ہر حال میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور دنیا کی ہر قوم نے اس صفت سے متصف ہو کر ہی اس دنیا میں فلاح و کامرانی حاصل کی ہے، مگر اسلام میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے، کیونکہ یہاں ایک طرف تو منزلِ مقصود ایک غیر مرئی ذات کی رضا جوئی ہے اور دوسرے اس ذات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو معیارات قائم کیے گئے ہیں وہ بھی ایسے نہیں کہ انہیں حواس کے پیمانوں سے ماپا جا سکے۔ اُن کو وزن کرنے کے لیے ایک دوسری میزان اور دوسرا مقوم ہے اور وہ ان کا دینی نفع اور اُخروی اجر ہے۔ ایک مسلمان جب اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اُس کا رب اللہ ہے اور وہی بلا شرکت غیرے اُس کا خالق، مالک اور فرمانروا ہے تو پھر اُسے صادق القول ثابت ہونے کے لیے مختلف آزمائشوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی اُس پر رزق کے دروازے کشادہ کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ان مادی وسائل اور اسباب کو اپنا الٰہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کا امین ہے اور انہیں صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ہی خرچ کرتا ہے۔ کبھی اُسے تنگی اور مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے عمل سے یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیاوی مصائب اصل مقصد سے اُسے باز نہیں رکھ سکتے بلکہ مقصد کے ساتھ وابستگی کو اور بڑھاتے ہیں۔ کبھی راستے کی مشکلات خود بخود اُس پر کھول دی جاتی ہیں مگر ایک مسلمان اسے اپنے تدبر اور تفکر کی کرشمہ سازی سمجھنے کے بجائے اسے فضلِ ایزدی سمجھتا ہے اور اگر کبھی مصلحتِ الٰہی اُس کی راہ میں سنگِ گراں حائل کر دیتی ہے تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تائیدِ ربانی کے بھروسے ان پر غالب آنے کی سعی کرتا ہے۔ غرض مختلف طریقوں سے خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور خدا کے یہ فرمانبردار بندے اُس کے فضل کے سہارے زندگی کی اُن پرپیچ راہوں میں ثابت قدم رہ کر اپنی متاعِ ایمان کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ آزمائش

ایمان کی ایک لازمی اور ضروری شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (آل عمران - ۱۸)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۔ (عنکبوت - ۱)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ (توبہ - ۳)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا۔ اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ ایک مسلمان جب اس دنیا کے مصائب و شدائد سے گزارا جاتا ہے تو اس عمل کا مقصد اُسے مفلوج یا برباد کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُس کی حقیقی غرض یہ ہوتی ہے کہ اُسے نہ صرف ہر قسم کے کھوٹ اور آلائش سے پاک کر کے کندن بنا دیا جائے بلکہ اُسے ایک ایسا موقع بھی فراہم کیا جائے جس میں وہ اپنے آپ کو ایمان میں سچا اور کھرا ثابت کر سکے۔

---

ایک شریر اور مفسد انسان کسی وقتی جذبے کے زیر اثر آ کر کبھی کبھار ایک نیک سے نیک کام

سرانجام دے سکتا ہے، اور اسی طرح ایک شریف سے شریف انسان کسی ہنگامی جوش کے تحت ایک بدترین فعل کا ارتکاب کر سکتا ہے لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکال سکتے کہ ان دونوں کی زندگیوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ برا آدمی اس لیے نیک نہیں کہلا سکتا کہ اُس نے زندگی میں کوئی ایک آدھ اچھا کام کر دیا ہے اور ایک نیک آدمی کبھی اس بنا پر بُرا نہیں کہلا سکتا کہ اُس سے نادانستہ طور پر ایک غلطی کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی شخص کے نیک یا بد ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کا انحصار ایک آدھ فعل پر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اندازِ زیست یا اسلوبِ حیات کو بحیثیتِ مجموعی دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ یہی چیز زندگی کا رخ متعین کرتی ہے۔ زندگی میں افعال و اعمال اگرچہ بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم زندگی کی عام ڈگر ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کوئی نیک کام سرانجام دے لینا نہایت سہل اور آسان ہے لیکن پوری زندگی کو پاکبازانہ گزارنا بہت دشوار منزل ہے۔

اصل چیز نیک عمل نہیں بلکہ نیک روش ہے۔ عمل تو اس روش کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے لہٰذا نیک اور بد زندگی کے درمیان حدِ فاصل کسی ایک عمل کے ذریعہ نہیں کھینچی جا سکتی بلکہ ان کے درمیان جو چیز نشانِ امتیاز ہے وہ صرف اندازِ زیست ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندازِ زیست مختلف اعمال کے مجموعہ سے عبارت ہے لیکن اس میں افعال و اعمال کے علاوہ کسی فرد یا قوم کا نظریہ بھی شامل ہوتا ہے جس کی حیثیت سیمنٹ کی سی ہوتی ہے اور وہ انسان کے مختلف اعمال کو باہم ایک دوسرے سے پیوست کر کے سیرت و کردار کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرتا ہے۔ فکر و عمل کے باہمی امتزاج سے اٹھائی ہوئی کیرکٹر کی اس ٹھوس عمارت میں کسی ایک فعل یا عمل کے مقابلے میں زیادہ پائیداری اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔ پھر ایسے تمام افعال جو کسی نظریۂ زندگی کے طفیل معرضِ وجود میں آئے ہوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتے ہیں اور اس طرح زندگی میں ایک فطری وحدت نمودار ہوتی ہے جس فرد کی زندگی کے مختلف مظاہر میں ہم رنگی پائی جائے اُس کے بارے میں سمجھ لیجیے کہ وہ

ایک خاص طرزِ فکر کا حامل ہے یا سادہ الفاظ میں وہ اپنا ایک مقصد یا ایمان رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی کبھی مرغِ باد نما نہیں بن سکتی جس کے رُخ کو مادی حوادث کے تند و تیز جھونکے ہر لمحہ بدلتے رہیں۔ اس کی حیات ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جو دنیا کے ہر رہرو کو منزلِ مقصود کا پتہ دیتا ہے۔

ایک زندہ و پائندہ خدا پر ایمان لانے والے سے بڑھ کر آخر کس شخص کی زندگی میں پائیداری اور استواری ہو سکتی ہے۔ اور ایک مومن سے بڑھ کر کون شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اُس کی زندگی میں وحدت اور یکسانیت ہو۔ جو شخص اللہ پر ایمان لانے کا دعویدار ہے وہ در حقیقت اپنے دل و جان سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اُس کی زندگی کی غایتِ اولیٰ اپنے مالک کی رضا جوئی ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے وہ جیتا ہے، تگ و دو کرتا ہے، مصائب برداشت کرتا ہے اور بالآخر اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اگرچہ زندگی کے مختلف منازل سے گزرتا ہے لیکن ان سب میں اُس کے سامنے مقصد صرف یہی ایک رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک مسلمان کے نزدیک دُکھ اور سکھ، مسرت اور غم، کامیابی و ناکامی سب اعتباری باتیں ہیں۔ ایک مسلمان اُس وقت تک کامیاب ہے جب تک اُسے اپنے مقصد کے ساتھ عشق اور وابستگی ہے اور وہ اس وقت ناکام ہے جب اُس کی منزلِ مقصود اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس بنا پر ایک مسلمان کی کامیابی اور ناکامی خارجی پیمانوں سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کو معلوم کرنے کے لیے اُس کے اپنے سینے ہی میں ایک پیمانہ لگا دیا گیا ہے جسے عام اصطلاح میں دل، قلب یا وجدان کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ سلطنتوں کی سلطنتیں فتح کرتا چلا جائے۔ مگر اللہ کے نزدیک اُن کے یہ سارے کارنامے اس وجہ سے بے وزن ہو کر رہ جائیں کہ ان کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق نہ تھا بلکہ کشور کشائی اور حصولِ اقتدار تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ایک انچ بھر زمین حاصل نہ کر سکے مگر وہ اللہ کے ہاں محبوب ہو کیونکہ اس کا مقصد اللہ کے دین کی سربلندی تھا اور اس کے لیے سعی کرنے کا حق اُس نے ادا کر دیا۔ یہاں اصل چیز مقصد اور اخلاص ہے۔ اور یہی دو چیزیں اندازِ زیست کی تشکیل کرتی ہیں۔

---

اس ضمن میں ایک چیز کی وضاحت نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم زندگی میں یکسانیت اور صبر و ثبات کا جو بار بار ذکر کر رہے ہیں تو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مسرت اور غم، فتح مندی اور ناکامی کے سارے جذبات اور احساسات سے ہمیں یکسر محروم کر کے ہمارے اندر یونانی فلاسفہ کی سی رواقی (  ) بے پروائی کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ اسلام کا مقصد ہمیں بے حس بنانا نہیں بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ کامرانی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یا ناکامی کی چوٹیں سہتے ہوئے بھی ہم اپنے خالق اور مالک کو بھولنے نہ پائیں۔ اگر ہم سے ہمارے جذبات و احساسات ہی سلب کر لیے جائیں تو پھر تو اسلام کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اسلام ہم سے ہماری انسانیت اور آدمیت چھیننے نہیں آیا بلکہ ہمیں یہ سکھانے آیا ہے کہ ہم زندگی کی مختلف کیفیات سے گذرتے ہوئے اپنے خالق سے اپنا تعلق منقطع نہ کرنے پائیں۔ قرآن پاک اور احادیثِ نبوی میں اکثر مقامات پر اس امر کی صراحت موجود ہے۔ مثال کے طور پر مصائب کے ہجوم میں گھر کر مضطرب اور پریشان ہونا بالکل فطری امر ہے اور اس سے انبیاء تک متاثر ہوئے ہیں:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۔ (البقرہ - ۲۶)

پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

یہ آیت اس امر کا صاف اظہار کر رہی ہے کہ حوصلہ شکن حالات میں پریشان ہو جانا بالکل ایک فطری چیز ہے۔ اسی طرح احادیث میں اُس سب سے زیادہ ضبط اور صبر کرنے والی ذاتِ اقدس کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی آنکھوں سے بھی کبھی کبھی غم انگیز منظر دیکھ کر آنسو بہہ جایا کرتے تھے۔

وعن أبي زيد أسامة بن زيد بن حارثة مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم

حضرت اُسامہ بن زید بن حارثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے محبوب اور محبوب

وعن اسامة بن زيد رضي الله عنه قال ارسلت بنت النبي صلى الله عليه وسلم ان ابني قد احتضر فاشهدنا فارسل يقرئ السلام و يقول ان لله ما اخذ وله ما اعطى وكل شيءٍ عنده باجل مسمى، فلتصبر ولتحتسب، فارسلت اليه تقسم عليه ليأتينها فقام و معه سعد بن عبادة ومعاذ بن جبل وأبي بن كعب وزيد بن ثابت ورجال رضي الله عنهم فرفع الى رسول الله صلى الله عليه وسلم الصبي فاقعده في حجره ونفسه تتقعقع، ففاضت عيناه فقال سعد يارسول الله ما هذا؟ فقال هذه رحمة جعلها الله تعالى في قلوب عباده۔

(بخاری، مسلم)

اسامہ بن زید کے بیٹے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپکے پاس پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا قریب مرگ ہے آپ تشریف لے آئیے، آپ نے سلام کہلا بھیجا اور فرمایا اللہ ہی کے لیے ہے جو اُس نے لیا اور جو اُس نے دیا اور ہر چیز کا اُس کے پاس ایک وقت مقرر ہے، صبر کرو اور اجر طلب کرو، انہوں نے پھر کہلا بھیجا کہ آپ جلدی تشریف لائیے، یہ سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور آپکے ساتھ سعد بن عبادہؓ، معاذ بن جبل، اُبیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت اور بہت سے لوگ تھے۔ آپکے پاس بچہ اٹھا کر لایا گیا، آپ نے اسے گود میں لے لیا اور اس وقت وہ دم توڑ رہا تھا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے حضرت سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے۔

---

قرآنِ پاک اور حدیثِ نبویؐ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں صبر سے مراد جذبات و احساسات کی محرومی نہیں بلکہ اسلامی اصطلاح میں اس کے معنی پامردی، دل کی مضبوطی اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اسلام ہمیں بے حس چٹان بنانا نہیں چاہتا بلکہ ہمیں ایک صاحبِ دل انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اُس کا منشا یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنے پہلو میں دل کی جگہ پتھر باندھ لیں اور اپنی حس کو اس حد تک مُردہ کر لیں کہ مسرّت و غم کی مختلف کیفیات ہم پر بالکل اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اسلام ہمارے سارے احساسات کو زندہ رکھنے کا سامان کرتا ہے، ہمارے قلب کو تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ بنانے کا آرزومند ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ میں جو دعائیں موجود ہیں اگر آپ انہیں اس

بغورِ نظر سے مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دینِ حق انسان کے جذبات اور احساسات کو کس خوبی سے جِلا دیتا ہے۔ یہاں کسی تفصیل کا موقع نہیں۔ ہم یہاں صرف چند دعائیں درج کرتے ہیں جن سے اس چیز کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ)

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں اگر کوئی قصور ہو جائے، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ممتحنہ)

اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے اور ہم سے درگزر فرما۔ اے رب ہمارے تو ہی زبردست اور حکیم ہے

اللھم انی اعوذ بک من العجز والکسل والجبن والھرم والمغرم والماثم ومن عذاب النار وفتنۃ النار وفتنۃ القبر وعذاب القبر وشر فتنۃ الغنا وشر فتنۃ الفقر ومن شر فتنۃ المسیح الدجال ومن فتنۃ المحیا والممات ومن القسوۃ والغفلۃ والعیلۃ والذلۃ والمسکنۃ والکفر والفسوق والشقاق والسمعۃ والریاء ومن الصمم والبکم والجنون والجذام وسیی الاسقام وضلع الدین ومن الھم والحزن والبخل وغلبۃ الرجال واعوذ بک

اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں پست ہمتی اور سستی اور بزدلی اور بڑھاپے سے، قرض داری اور گناہ گاری سے، دوزخ کے عذاب اور آگ کے فتنے سے، قبر کے فتنے اور قبر کے عذاب سے، مال و زر اور محتاجی کے بدترین فتنوں سے، مسیح دجال کے برے فتنے اور زندگی و موت کی آزمائشوں سے، سنگدلی اور غفلت اور تنگدستی اور ذلت و خواری سے، کفر اور فسق سے اور جھگڑالو پن اور شہرت پسندی اور ریاکاری سے، بہرے اور گونگے ہونے سے، جنون اور جذام اور بری بیماریوں سے، بارِ قرض اور فکر و غم سے، بخل اور لوگوں کے غلبہ سے، اور اس سے کہ ناکارہ عمر

من علم لا ینفع و من نفس لا تشبع و من دعوۃ لا یستجاب لھا۔

تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے اور اُس علم سے جو نافع نہ ہو اور اُس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور اُس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اُس دُعا سے جو قبول نہ ہو۔

ان دعائیہ کلمات کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں جذبات و احساسات کی کس قدر حرارت موجود ہے۔ کیا یہ واردات کسی ایسے دل کی پیداوار ہیں جو مر گیا ہو یا یہ ایک ایسے قلب کی تخلیق ہیں جن میں زندگی کی صحت اور توانائی موجود ہے احساس مجبوری جو ان کلمات کی جان ہے کسی شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ عمل کا زبردست محرک ہے۔ اس کی بدولت انسان کا خدا کے ساتھ رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔

نا صبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ نا صبور نہیں

---

آئیے اب ایک نگاہ ذرا اُن مراحل پر بھی ڈال لیں جہاں صبر ہی بہترین زادِ راہ ہے۔

ایک انسان جو دعوتِ حق کے پاک اور مقدس عزم کے ساتھ اٹھتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ حق جس پر اس کائنات کا سارا نظام چل رہا ہے اور جس کی گواہی دنیا کی ہر چیز دے رہی ہے، وہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ اجنبی چیز ہے۔ انسانوں کی اکثریت اس نام کو سن کر چونکتی ہے، اس سے بر اساں ہوتی ہے، اس کی آواز پر کان بند کر لیتی ہے۔ یہ چیز ایک داعی کے لیے بڑی ہی پریشان کن ہوتی ہے۔

پھر اس مخالفت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ معاملہ صرف تغافل اور بے حسی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اسی حق کے خلاف جو درحقیقت اُن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی میراث ہوتی ہے، لوگ ایک محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ اسے دبانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے تیار کیے جاتے ہیں، اس کو بلند کرنے والوں پر کبھی آرے چلائے جاتے ہیں، کبھی انہیں صلیب دی جاتی ہے، کبھی انہیں اپنے وطن سے نکالا جاتا ہے، کبھی انہیں قید و بند میں ڈال دیا جاتا ہے اور کبھی انہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا ہے۔ الغرض اُن پہ

خدا کی زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے۔

ایک طرف نوعِ انسانی کے ہاتھوں اُن کا یہ حشر ہوتا ہے اور دوسری طرف ذات باری تعالیٰ اُن کی آزمائش شروع کر دیتی ہے۔ وہ کچھ مدت انتظار کر کے دیکھتی ہے کہ کون اپنے دعوے میں پختہ اور قول میں سچا اور کھرا ہے۔ ان حالات میں جب ایک طرف حق کی بیکسی، بیچارگی اور بے بسی سامنے موجود ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورشیں اور ہنگامہ آرائیاں ہجوم کر رہی ہوں، انسان کا گھبرا اٹھنا ایک فطری امر ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (طور-۲)
(اور اے رسولؐ) صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کر، تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (یونس-۱۱)
اور صبر کر یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے۔ وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔

فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود-۴)
صبر کر، یقیناً انجام کار پرہیزگاروں ہی کے حق میں ہے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (روم-۶)
پس صبر کر، بلاشبہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا (دھر-۲)
صبر کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر، اور ان (مخالفین) میں سے کسی گنہگار نافشکرے کا کہا نہ مان۔

اس مضمون کو ایک حدیث میں ابو عبداللہ خباب بن الارت کی روایت سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضور سرورِ کائنات ایک چادر سے ٹیک لگائے خانہ کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ آپ ہمارے لیے مدد کیوں نہیں مانگتے؟ آپ ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:-

قد کان قبلکم یوخذ الرجل فیحفر لہ فی الارض فیجعل فیھا ثم یوتی بالمنشار
اگلی امتوں میں یہ کچھ گزر چکا ہے کہ ایک آدمی پکڑ لیا جاتا پھر اُس کے لیے گڑھا کھدوا جاتا اور اسے گڑھے میں

فیوضع علی راسہ فیجعل نصفین ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمہ وعظمہ مایصدہ ذالک عن دینہ، واللہ لیتمن اللہ ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لایخاف الا اللہ والذئب علی غنمہ ولکنکم تستعجلون۔

رکھ کر آرہ اس کے سر پر چلایا جاتا یہاں تک کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور لوہے کی کنگھی آدمی کے سر پر پھیری جاتی اور وہ ہڈی اور گوشت میں دھنستی ہوئی پار ہو جاتی۔ مگر یہ تکلیفات ان لوگوں کو راہِ حق سے نہ ہٹا سکیں خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اس کام کو یقیناً پایۂ تکمیل تک پہنچائیگا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اللہ کے سوا کسی کا اسے خوف ہوگا ہاں بھیڑیے کا اس کو اپنی بکریوں کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے لیکن تم جلدبازی سے کام لیتے ہو۔

---

صبر کے معنی صرف یہی نہیں کہ آدمی مصائب کو برداشت کرے اور بیقرار نہ ہو، بلکہ اس میں تسلیم و رضا کا عنصر بھی شامل ہے۔ ایک داعیٔ حق کا فرض ہے کہ اس دعوت کی راہ میں جو مصیبتیں اور مشکلات آئیں انہیں خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کرے اور یہ یقین رکھے کہ جب اللہ تعالیٰ مناسب سمجھے گا تو وہ ان تکلیفات کو خود بخود دور کر دیگا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصائب کو جس رضاو تسلیم کے ساتھ برداشت کیا اس کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۔ (ص۔ ۳)

ہم نے بلاشبہ ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ تھا، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا۔

اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لخت جگر، حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مطالبہ خداوندی کا ذکر کیا تو انہوں نے حکمِ الٰہی پر پوری تسلیم و رضا کا اظہار کیا اور فرمایا:

یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ

ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کر ڈالیے

اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صافات - ۲) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اسی تسلیم و رضا کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

وامر بالمعروف وانہ عن المنکر و نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے

اصبر علی ما اصابک ان ذالک من عزم الامور اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

مصائب کے پیش آنے پر تسلیم و رضا کے طرزِ عمل کا ایک ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر کی یہی کیفیت تو درحقیقت ایمان باللہ کی جان ہے۔ یہی چیز ایک خدا پرست کو مادہ پرست سے ممیز کرتی ہے۔ مادہ پرست انسان کے فکر کا زاویہ چونکہ مادہ کے محور پر گھومتا ہے اس لیے وہ زندگی کے سارے مصائب کی علتِ غائی صرف مادی حالات کی ناموافقت کو قرار دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تکلیفات نے اگر اسے گھیرا ہے تو اس کی وجہ بجز اس اور کچھ نہیں کہ وہ حواس کی دنیا اور اس کے مال و اسباب کو اپنے لیے کارآمد بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ زندگی کے شدائد و مصائب میں ایک گہری حکمت و دانائی دیکھتا ہے۔ وہ ان سے عبرت پکڑتا ہے۔ اس کے نزدیک مسرت و غم، آرزوؤں کی کشمکش، انسانیت کی کامرانیاں اور حسرتیں، قوموں کے عروج و زوال مادی حوادث کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ یہ سب اللہ کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پیچھے ایک زبردست مدبر کی تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان خارجی حوادث کے پس پردہ جھانک کر اس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے جس کے دراصل یہ سارے مظاہر ہیں اور پھر اپنے آپ کو بالکل رضاکارانہ طور پر اس حقیقت کے تابع کر دیتا ہے۔ یہی معراجِ انسانیت اور کمالِ آدمیت ہے۔ یہی چیز ایک مومن کے قلب کو طمانیت کے نور سے بھر دیتی ہے۔ اس کے ذہن کو آفاقیت، نگاہوں کو بلندی اور علم کو وسعت عطا کرتی ہے۔ یہی مقام ہے جس پر پہنچ کر ایک انسان چٹان بن جاتا ہے، گر کر سنبھلتا ہے اور مصائب کے ہجوم میں گھر کر بھی اپنے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ یہ اسی ایمان کا اعجاز تھا کہ عین اس حالت میں جب کہ ابوفکیہہ کو پیٹ پیٹ کر مختل الحواس کر دیا گیا تھا تو ان سے ایک گزرتے ہوئے گبریلے کے بارے میں استہزاءً کہا گیا کیا تیرا پروردگار یہی تو نہیں؟ تو انہوں نے بلا تامل فرمایا: میرا اور تیرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

صبر کے معاملے میں ایک اور ضروری چیز تحمل اور بردباری ہے۔ آدمی جب تبلیغ دعوت کا کام کرتا ہے

تو اسے مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان میں ایک مختصر تعداد اُن سلیم الفطرت لوگوں کی ہوتی ہے جو حق کی آواز کو سنتے ہی اُس پر اس طرح لبیک کہتے ہیں گویا کہ وہ پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ ان کے معاملے میں تو ایک داعی کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی بلکہ وہ ہمیشہ السابقون الاوّلون ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تعداد میں ہمیشہ کم ہی رہے ہیں۔ ایک اچھی خاصی تعداد اُن لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی نیتیں خواہ ٹھیک ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات کے لاتعداد کانٹے چبھے ہوتے ہیں۔ ان کانٹوں کو نکالنا بڑی دیدہ ریزی، محنت اور حکمت چاہتا ہے۔ اس میں انتہائی صبر و ضبط اور ہمدردی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ اس راہ میں ایسے لوگوں سے بھی بالکل ناگزیر طور پر سامنا ہوتا ہے جو اپنے مزاج کے لحاظ سے بڑے ہٹ دھرم اور ضدی ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بسا اوقات ایسی نفرت انگیز حرکات کا ارتکاب کر دیتے ہیں کہ اگر صبر و ضبط کی زبردست مشق نہ ہو تو آدمی جادہ مستقیم سے ہٹ جائے۔ یہ کمینہ خصلت لوگ نت نئی بیہودگیاں سوچتے ہیں اور ہر روز او چھے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حق کے علمبرداروں پر حملہ کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے قصوروں کو معاف کر دیں اور ان کی بیہودگیوں کے مقابلے میں اخلاقی پامردی دکھلائیں۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ - وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۔ (نحل - ۱۶) | اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر و برداشت کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں لیکن خدا کی مدد سے، اور اُن کا غم نہ کر اور نہ اُنکی سازشوں سے دل گرفتہ ہو |
| وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (فصلت - ۵) | بھلائی اور برائی برابر نہیں ہیں۔ برائی کا جواب اچھائی سے دو تو تم دیکھو گے کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی وہ قریبی دوست ہو جائے گا مگر یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اُسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہوتا ہے۔ |

اسی مضمون کی حدیث نبوی میں اس طرح صراحت کی گئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس الشدید بالصرعۃ انما الشدید من یملک نفسہ عند الغضب۔ (صحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلوان وہ نہیں ہے جو حریف کو میدان میں پچھاڑ دے۔ بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے

ایک دوسری حدیث میں صبر کی ایک نہایت ہی جامع و مانع تعریف ملتی ہے اور اسے ایمانی اخلاق کی خشتِ اول قرار دیا گیا ہے:-

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلث من اخلاق الایمان من اذا غضب لم یدخلہ غضبہ فی باطل ومن اذا رضی لم یخرجہ رضاہ من حق ومن اذا قدر لم یتعاط مالیس لہٗ۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تین باتیں ایمانی اخلاق میں سے ہیں۔ جب غصہ آئے تو انسان مغلوب الغضب ہو کر باطل کی سرحد میں نہ گھس جائے، جب کسی سے خوش ہو تو یہ خوشی اسے حق کے حدود سے نہ نکال لے جائے، اور جب آدمی قدرت و اقتدار پائے تو وہ کام نہ کرنے لگے جس کا اسے حق نہیں ہے

یہ وہ مقام ہے جس پر ایک مسلمان کے صبر اور توکل کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ اپنے فکر و عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ اپنے خالق کے ساتھ اس کا تعلق ہنگامی اور عارضی نہیں بلکہ نہایت پختہ اور پائیدار ہے۔ اور اسی مقامِ محمود کو حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بڑے زوردار الفاظ میں یہ بشارت دیتا ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ (حم السجدہ ع ۴)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے اُن پر فرشتے اُترتے ہیں (اور اُن سے فرمایا جاتا ہے) کہ تم نہ خوفزدہ ہو اور نہ غمگین اور اُس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ہم تمہارے اس دنیا کی عارضی زندگی میں بھی دوست ہیں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو تمہارے نفس چاہیں اور تمہارے لیے اس میں جو تم مانگتے ہو بخشش والے رحمت والے کی طرف سے میزبانی کے طور پر

# تفہیم القرآن

## الشعراء

## (۵)

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔[1] یاد کرو جبکہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔[2] لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

---

[1] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۷ تا ۵۰ - ۳۴۹ تا ۳۵۴ - ۵۱۵ - ۵۱۶ - ۶۲۶

مزید تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات بھی پیش نظر رہیں: النمل رکوع ۴، الذاریات رکوع ۲، القمر رکوع ۲، الحاقہ رکوع ۱، الفجر، الشمس۔

اس قوم کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی، جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف)۔ مگر اس کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلورا اور اجنٹہ کے غاروں جیسے محل بن رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا اور زمین ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔ حضرت صالح کی دعوتِ حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا اور اونچے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ، "جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے"۔

کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے؟[۱۵] اِن باغوں اور چشموں میں؟ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟[۱۶] تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔[۱۷] اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اُن بے لگام

۱۴ حضرت صالح کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کی شہادت خود اس قوم کے لوگوں کی زبان سے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے: قَالُوا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود۔ رکوع ۶) "انھوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے تو تم ہمارے درمیان ایسے آدمی تھے جس سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں"۔

۱۵ یعنی کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہارا یہ عیش دائمی اور ابدی ہے؟ کیا اس کو کبھی زوال آنا نہیں ہے؟ کیا تم سے کبھی اِن نعمتوں کا حساب نہ لیا جائیگا اور کبھی اِن اعمال کی باز پرس نہ ہو گی جن کا تم ارتکاب کر رہے ہو؟

۱۶ اصل میں لفظ هَضِيْمٌ استعمال ہوا ہے جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو پھلوں سے لد کر جھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔

۱۷ جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور رہے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عالی شان محل بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں جس طرح عاد کو ذَاتِ الْعِمَادِ (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح ثمود کا ذکر اس خصوصیت کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ، "وہ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں"۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے، تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا (الاعراف، رکوع ۱۰)۔ اور ان تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے

لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے[۶]" انہوں نے جواب دیا "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے[۷] تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے[۸]" صالح نے کہا "یہ اونٹنی ہے[۹]۔ ایک دن اس کے پانی پینے کا ہے اور ایک دن تم

داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف امراء اور اہلِ ثروت رہنے کے لیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

۶؎ یعنی اپنے اُن امراء و رؤسا اور اُن رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ مسرف لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں، میری امانت و دیانت کو تم پہلے سے جانتے ہو، اور میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اٹھا ہوں ــــ یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدنی و اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

۷؎ "سحر زدہ" یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔ قدیم تصورات کے مطابق پاگل پن یا تو کسی جن کے اثر سے لاحق ہوتا تھا یا جادو کے اثر سے۔ اس لیے وہ جسے پاگل کہنا چاہتے تھے اس کو یا تو "مجنون" کہتے تھے یا مسحور اور مسحّر۔

۸؎ یعنی بظاہر تو ہم میں اور تجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ ہم تجھے خدا کا فرستادہ مان لیں لیکن اگر تو اپنے مامور من اللہ اور مرسل من جانب اللہ ہونے کے دعوے میں سچا ہے تو کوئی ایسا محسوس معجزہ پیش کر جس سے ہمیں یقین آجائے کہ واقعی کائنات کے خالق اور زمین و آسمان کے مالک نے تجھ کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

۹؎ معجزے کے مطالبے پر اونٹنی پیش کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام اونٹنی نہ تھی

سب کے پانی پینے کا[۱۱] اس کو کبھی نہ چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلیگا۔ مگر انہوں نے

جیسی ہر عرب کے پاس وہاں پائی جاتی تھی، بلکہ مزید اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خلقت میں کوئی ایسی چیز تھی جسے معجزے کی طلب پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ اگر حضرت صالح اس مطالبے کے جواب میں یونہی کسی اونٹنی کو پکڑ کے کھڑا کر دیتے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت فضول حرکت ہوتی جس کی کسی پیغمبر تو درکنار، ایک عام معقول آدمی سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات یہاں تو صرف سیاق کلام ہی کے اقتضاء سے سمجھ میں آتی ہے لیکن دوسرے مقامات پر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس اونٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں فرمایا گیا هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً، "یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی کے طور پر ہے" اور سورۂ بنی اسرائیل میں اس سے بھی زیادہ پُرزور الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:-

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (رکوع ۶)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں، اور ہم ثمود کے سامنے آنکھوں دیکھتے اونٹنی لے آئے پھر بھی انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔ نشانیاں تو ہم خوف دلانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں (تماشا دکھانے کے لیے تو نہیں بھیجتے)۔

اس پر مزید وہ چیلنج ہے جو اونٹنی کو میدان میں لے آنے کے بعد اس کافر قوم کو دیا گیا۔ اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ صرف ایک معجزہ ہی پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جاسکتا تھا۔

[۱۱] یعنی ایک دن تنہا یہ اونٹنی تمہارے کنوؤں اور چشموں سے پانی پیے گی اور ایک دن ساری قوم کے آدمی اور جانور پییں گے۔ خبردار، اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی لینے کی جگہ پھٹکنے نہ پائے۔ یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا۔ لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی ہی کے مسئلے پر خون خرابے ہو جاتے تھے، قبیلہ قبیلے سے لڑ جاتا تھا اور جان جوکھوں کی بازی لگا کر کسی کنوئیں یا چشمے سے پانی پینے کا حق حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سرزمین میں کسی شخص کا اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ ایک دن میری اکیلی اونٹنی پانی پیے گی اور باقی ساری قوم کے آدمی اور جانور صرف دوسرے دن ہی

اس کی کوچیں کاٹ دیں[11] اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے۔ عذاب نے انہیں آلیا۔[12]

---

پانی پی سکیں گے، یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پوری قوم کو لڑائی کا چیلنج دے رہا ہے۔ ایک زبردست لشکر کے بغیر کوئی آدمی عرب میں یہ بات زبان سے نہ نکال سکتا تھا اور کوئی قوم یہ بات اُس وقت تک نہ سُن سکتی تھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ رہی ہو کہ چیلنج دینے والے کی پشت پر اتنے شمشیر زن اور تیر انداز موجود ہیں جو مقابلے پر اٹھنے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ لیکن حضرت صالح نے بغیر کسی لاؤ لشکر کے تنہا اٹھ کر یہ چیلنج اپنی قوم کو دیا اور قوم نے صرف یہ کہ اس کو کان لگا کر سنا بلکہ بہت دنوں تک ڈر کے مارے وہ اس کی تعمیل بھی کرتی رہی۔

سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ "یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی کے طور پر ہے، چھوڑ دو اسے کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے، ہرگز اسے بُرے ارادے سے نہ چھونا" یعنی چیلنج صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ہر دوسرے روز اکیلی یہ اونٹنی دن بھر سارے علاقے کے پانی کی اجارہ دار رہے گی، بلکہ اس پر مزید یہ چیلنج بھی تھا کہ یہ تمہارے کھیتوں اور باغوں اور نخلستانوں اور چراگاہوں میں دندناتی پھرے گی، جہاں چاہے گی جائیگی، جو کچھ چاہے گی کھائے گی، خبردار جو کسی نے اسے چھیڑا۔

[11] یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت انہوں نے حضرت صالح سے یہ چیلنج سنا اسی وقت وہ اونٹنی پر پل پڑے اور اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں، بلکہ کافی مدت تک یہ اونٹنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی، لوگ اس پر دلوں میں اُلجھتے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائے گا۔ سورۂ شمس میں اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا "جبکہ اٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی"۔ اور سورۂ قمر میں فرمایا گیا ہے فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ "انھوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی، آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمے لے کر اٹھا اور اس نے کوچیں کاٹ ڈالیں"۔

[12] قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اونٹنی

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع

لوطؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا[۱۰۹]۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی لوطؑ نے ان سے کہا تھا[۱۱۰] "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو[۱۱۱] اور تمہاری بیویوں میں اللہ نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟[۱۱۲] بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو[۱۱۳]۔"

---

مار ڈالی گئی تو حضرت صالحؑ نے اعلان کیا: تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ "تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو" (ہود-۶)۔ اس نوٹس کی مدت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح کچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سوکھی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین قصر انہیں اس آفت سے بچا سکے نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (القمر ۲)۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (اعراف ۱۰)۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (الحجر ۶)

[۱۰۹] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۱ تا ۵۳۔ ۳۵۵ تا ۳۵۹۔ ۵۱۱ تا ۵۱۵۔ مزید تفصیلات کے لیے: الانبیاء رکوع ۵۔ النمل رکوع ۴۔ العنکبوت رکوع ۳-۴۔ الصافات رکوع ۴۔ القمر رکوع ۲۔

[۱۱۰] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے اس غرض کے لیے چھانٹ لیا ہے کہ ان سے خواہشِ نفس پوری کرو حالانکہ دنیا میں بکثرت عورتیں موجود ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر میں ایک تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، ورنہ انسانوں میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں ہے بلکہ حیوانات میں سے بھی کوئی جانور یہ کام نہیں کرتا۔ اس دوسرے مفہوم کی صراحت سورۂ اعراف اور سورۂ عنکبوت میں یوں کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ

انہوں نے کہا" اے لوط، اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں اُن میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا[۱۷]"۔ اس نے کہا" تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں میں اُن میں شامل ہوں۔ اے پروردگار! مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے

---

مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ "کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا؟"

۱۵ اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو بیویاں خدا نے پیدا کی تھیں انہیں چھوڑ کر تم غیر فطری ذریعے یعنی مردوں کو اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ان بیویوں کے اندر خدا نے اس خواہش کی تکمیل کا جو فطری راستہ رکھا تھا اسے چھوڑ کر تم غیر فطری راستہ اختیار کرتے ہو۔ اس دوسرے مطلب میں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ وہ ظالم لوگ اپنی عورتوں سے بھی خلافِ وضعِ فطری فعل کا ارتکاب کرتے تھے۔

۱۶ یعنی تمہارا صرف یہی ایک جرم نہیں ہے، تمہاری زندگی کا تو سارا ہی بگاڑ حد سے زیادہ بگڑ چکا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے اس عام بگاڑ کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے: أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ (النمل)۔ "کیا تمہارا یہ حال ہو گیا ہے کہ کھلم کھلا دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے فحش کام کرتے ہو؟" أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ (العنکبوت)۔ "کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ مردوں سے مباشرت کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں علانیہ برے کام کرتے ہو؟" (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۱۲-۵۱۳)۔

۱۷ یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے، یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے، یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہو گا۔ سورۂ اعراف اور سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت لوطؑ کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شریر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّن

نجات دے[۶۸]"۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا، بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی[۶۹] پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر برسائی ایک برسات، بڑی ہی بُری بارش تھی جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی[۷۰]۔

---

تُرِیۡدُکُمۡ اِنَّھُمۡ اُنَاسٌ یَّتَطَھَّرُوۡنَ، لوط اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ ان "صالحین" کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔

۶۸ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے اعمالِ بد کے بُرے انجام سے بچا۔ اور یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اس بدکردار بستی میں جو اخلاقی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی چھوت کہیں ہماری آل اولاد کو نہ لگ جائے، اہلِ ایمان کی اپنی نسلیں کہیں اس بگڑے ہوئے ماحول سے متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے پروردگار ہمیں اس ہر وقت کے عذاب سے نجات دے جو اس ناپاک معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے ہم پر گزر رہا ہے۔

۶۹ اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے۔ سورۂ تحریم میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ کَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ فَخَانَتٰھُمَا (رکوع ۲) "یہ دونوں عورتیں ہمارے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں مگر انہوں نے اُن کے ساتھ خیانت کی"۔ یعنی دونوں ایمان سے خالی تھیں اور اپنے نیک شوہروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان دونوں نے اپنی کافر قوم کا ساتھ دیا۔ اسی بنا پر جب اللہ تعالیٰ نے قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا اور حضرت لوطؑ کو حکم دیا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرما دی کہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جاؤ، فَاَسۡرِ بِاَھۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَکَ اِنَّہٗ مُصِیۡبُھَا مَآ اَصَابَھُمۡ (ہود ۷) "پس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لیکر نکل جا اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جا، اُس پر وہی کچھ گزرنی ہے جو ان لوگوں پر گزرنی ہے"۔

۷۰ اس بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوط جب رات کے پچھلے پہر اپنے بال بچوں کو

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے

نے کر نکل گئے تو صبح پو پھٹتے ہی یکایک ایک زور کا دھماکا ہوا (فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ) ۔ ایک ہولناک زلزلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کر کے رکھ دیا (جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا)، ایک زبردست آتش فشانی انفجار سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے (وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ) اور ایک طوفانی ہوا سے بھی ان پر پتھراؤ کیا گیا (اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا) ۔

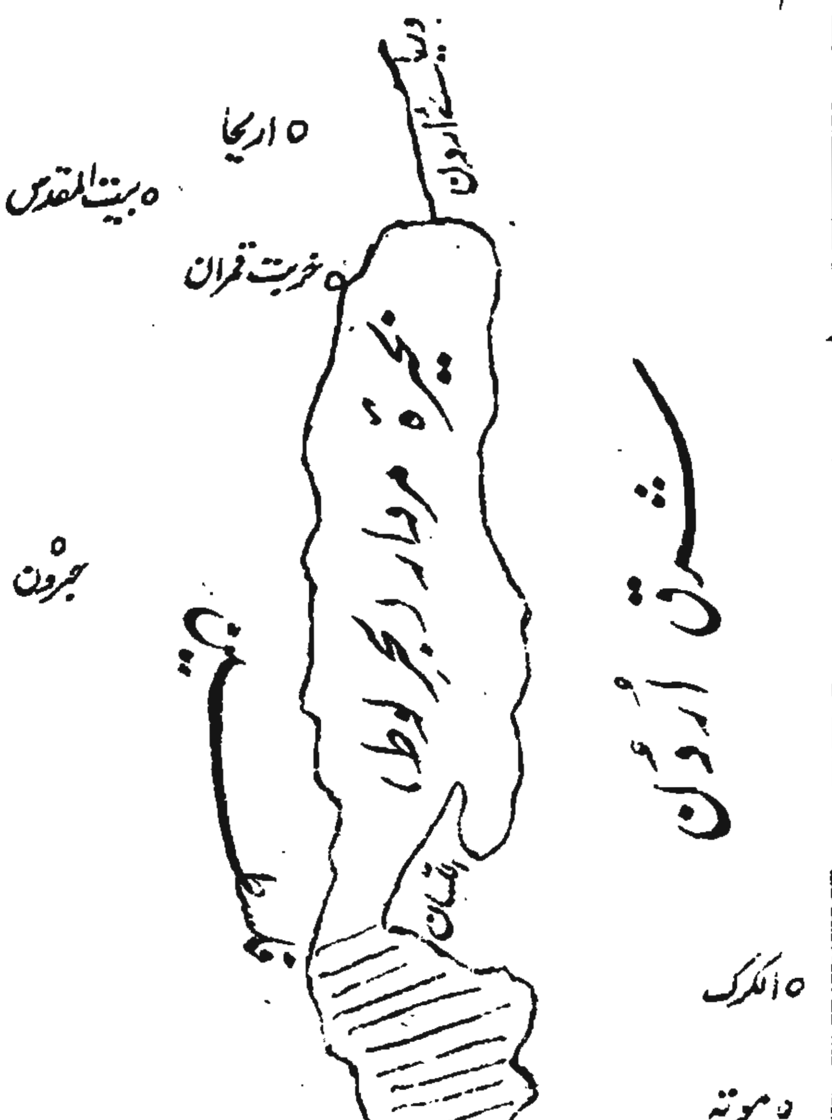
بائیبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریریں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

بحیرۂ مردار (DEAD SEA) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانے میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں برباد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار سکے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوشحالی کا دور ۲۳۰۰ قبل مسیح سے ۱۹۰۰ قبل مسیح تک رہا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیم اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائیبل میں "سِدّیم کی وادی" کہا گیا ہے، جس کے متعلق بائیبل کا بیان ہے کہ "وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی" (پیدائش باب ۱۳۔ آیت ۱۰) موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بحیرۂ مردار کے اندر غرق ہے، اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں بحیرۂ مردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے شرق اردن کے موجودہ شہر الکرک کے سامنے مغرب کی جانب اس بحیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما "اللسان" پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہیں پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے

کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ہے ع

(جیسے ملحقہ نقشے میں ہم نے آڑی لکیروں سے نمایاں کیا ہے) پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی سدیم تھی جس میں قوم لوط کے بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، اَدْمہ، ضبوئیم اور ضُغَر واقع تھے۔ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بحیرۂ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصہ ہے مگر رومی عہد میں یہ اتنا اتھلا تھا کہ لوگ اللسان سے مغربی ساحل تک چل کر پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں۔



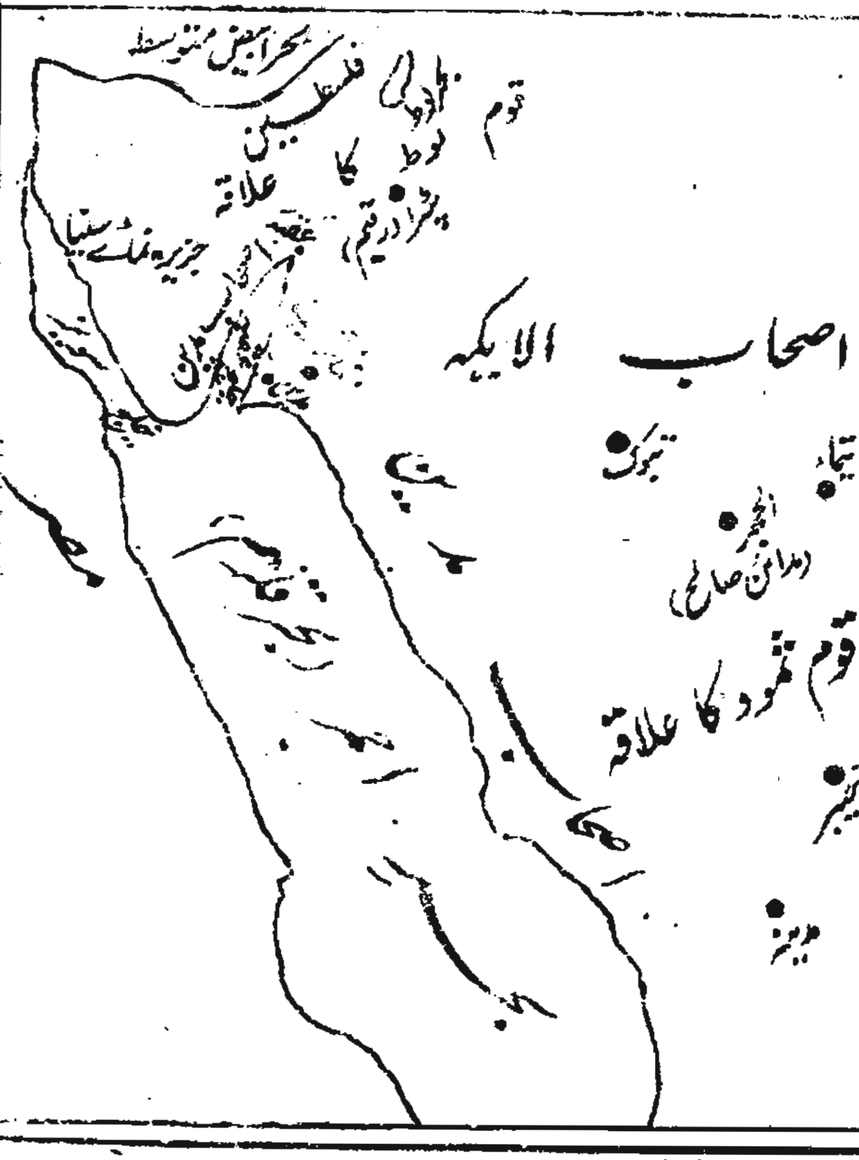

قوم لوط کا علاقہ

بائیبل اور قدیم یونانی و لاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نفط (پٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیر زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے۔ طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیسیں اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اڑ گیا۔ بائیبل کا بیان ہے

اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۱۱۲] یاد کرو جبکہ شعیب نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟

کہ اس تباہی کی اطلاع پاکر حضرت ابراہیم جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے (پیدائش باب ۱۹۔ آیت ۲۸)

۱۱۲ اصحاب الایکہ کا مختصر ذکر سورۂ الحجر میں پہلے گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۵۱۵)۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مدین اور اصحاب الایکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورۂ اعراف میں حضرت شعیب کو اہل مدین کا بھائی فرمایا گیا ہے (وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا)، اور یہاں اصحاب الایکہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ (اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ) (جبکہ ان سے شعیب نے کہا)، "ان کے بھائی" (اَخُوْهُمْ) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم




قرار دیتے ہیں، کیونکہ سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحاب مدین کے بیان ہوئے ہیں وہی یہاں اصحاب الایکہ کے بیان ہو رہے ہیں، حضرت شعیب کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے، اور آخر کار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور

مَیں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس

اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطُورا کے نام سے معروف تھی۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا، مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی، یا اصحاب مدین کہلایا، اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحرِ قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر مقام شہر مَدیَن تھا جس کی جائے وقوع ابوالفدا نے خلیج عَقَبہ کے مغربی کنارے اَیلہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قطُورا جن میں بنی ددان (DEDANITES) نسبتہً زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب میں تیماء اور تبوک کے درمیان آباد ہوئے اور ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں اَیکہ کہتے تھے۔ (یاقوت نے معجم البلدان میں لفظ اَیکہ کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہل تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں اَیکہ تھی)۔

اصحاب مَدیَن اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے، بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائیبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ لوگ بعلِ فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو ان کے اندر بھی انہوں نے شرک اور زناکاری کی وبا پھیلا دی (گنتی باب ۲۵ آیت ۱-۵۔ باب ۳۱ آیت ۱۶-۱۷)۔ پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی ان دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ بپا کر رکھا تھا، دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے، اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ "یہ دونوں (قوم لوط اور اصحاب الایکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے"۔ اور ان کی رہزنی کا ذکر سورۂ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے: وَلَا تَقْعُدُوْا

کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میرا اجر تو رب العٰلمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اُس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے" انہوں نے کہا "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے" شعیب نے کہا "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو[۲۲]" انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا[۲۳]، اور وہ

---

بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ "اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے کے لیے نہ بیٹھو"۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔

حضرت شعیب اور اہل مدین کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۵ تا ۵۸ - ۳۵۹ تا ۳۶۵ - اور سورہ عنکبوت رکوع ۴ -

۲۲ یعنی عذاب نازل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے اور وہ تمہارے کرتوت دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر وہ تمہیں اس عذاب کا مستحق سمجھے گا تو خود نازل فرما دیگا۔ اصحاب الایکہ کے اس مطالبے اور حضرت شعیب کے اس جواب میں کفار قریش کے لیے بھی ایک تنبیہ تھی۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مطالبے کرتے تھے، اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا "یا پھر گرا دے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے" (بنی اسرائیل - ۱۰)۔ اس لیے ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایسا ہی مطالبہ اصحاب الایکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اُس کا جو جواب انہیں ملا وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہاری طلب کا جواب بھی ہے۔

۲۳ اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک بارانِ عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب مدین کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے عذاب

بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے

کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ؏ ۱۰ع

یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۲۴۔ اسے لیکر تیرے دل پر امانت دار روح۲۵ اتری ہے۲۶

---

سے مختلف تھی۔ یہ جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے، چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے، اور ان پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ، اور وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ)۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش درست نہیں ہے بعض مفسرین نے عذاب یوم الظلّہ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثک من العلماء ما عذاب یوم الظلة فکذبه "علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلّہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو"

۲۴؎ تاریخی بیان ختم کر کے اب سلسلۂ کلام اسی مضمون کی طرف پھرتا ہے جس سے سورۃ کا آغاز فرمایا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر پلٹ کر پہلے رکوع کو دیکھ لینا چاہیے۔

۲۵؎ یعنی یہ "کتاب مبین" جس کی آیات یہاں سنائی جا رہی ہیں، اور یہ "ذکر" جس سے لوگ منہ موڑ رہے ہیں کسی انسان کی من گھڑت چیز نہیں ہے، اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصنیف نہیں کر لیا ہے، بلکہ یہ رب العلمین کی نازل کردہ ہے۔

۲۶؎ مراد ہیں جبریل علیہ السلام، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ۔ رکوع ۱۲) "کہہ دے کہ جو کوئی دشمن ہے جبریل کا تو اسے معلوم ہو کہ اسی نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے تیرے دل پر نازل کیا ہے" یہاں ان کا نام لینے کے بجائے ان کے لیے روح امین (امانت دار روح) کا لقب استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ رب العلمین کی طرف سے اس تنزیل کو لیکر کوئی مادی طاقت نہیں آئی ہے جس کے

تاکہ تو اُن لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) متنبّہ کرنے والے ہیں، صاف صاف عربی زبان میں[۲۷] اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے[۲۸]۔ کیا ان (اہلِ مکّہ) کے لیے یہ کوئی نشانی

---

اندر تغیّر و تبدّل کا امکان ہو، بلکہ وہ ایک خالص روح ہے بلاشائبۂ مادّیت۔ اور وہ پوری طرح امین ہے خدا کا پیغام جیسا اس کے سپرد کیا جاتا ہے ویسا ہی بلا کم و کاست پہنچا دیتی ہے، اپنی طرف سے کچھ بڑھا یا گھٹا دینا یا بطورِ خود کچھ تصنیف کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

۲۷؎ اس فقرے کا تعلق "امانت دار روح اتری ہے" سے بھی ہو سکتا ہے اور "متنبّہ کرنے والے ہیں" سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ امانت دار روح اسے صاف صاف عربی زبان میں لائی ہے، اور دوسری صورت میں معنی یہ ہونگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن انبیاء میں شامل ہوں جنہیں عربی زبان میں خلقِ خدا کو متنبّہ کرنے کے لیے مامور فرمایا گیا تھا، یعنی ہود، صالح، اسماعیل اور شعیب علیہم السّلام دونوں صورتوں میں مقصودِ کلام ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ ربّ العٰلمین کی طرف سے یہ تعلیم کسی مُردہ یا جناتی زبان میں نہیں آئی ہے، نہ اس میں کوئی معمّے یا چیستاں کی سی گنجلک زبان استعمال کی گئی ہے، بلکہ یہ ایسی صاف اور فصیح عربی زبان ہے جس کا مفہوم و مدّعا ہر عرب اور ہر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہو، بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے منہ موڑ رہے ہیں ان کے لیے یہ عذر کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اس تعلیم کو سمجھ نہیں سکے ہیں، بلکہ ان کے اعراض و انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اسی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں فرعونِ مصر اور قومِ نوح اور قومِ لوط اور عاد و ثمود اور اصحاب الایکہ مبتلا تھے۔

۲۸؎ یعنی یہی ذکر اور یہی تنزیل اور یہی الٰہی تعلیم سابق کتبِ آسمانی میں بھی موجود ہے۔ یہی خدائے واحد کی بندگی کا بلاوا، یہی آخرت کی زندگی کا عقیدہ، یہی انبیاء کی پیروی کا طریقہ اُن سب میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ سب کتابیں جو خدا کی طرف سے آئی ہیں شرک کی مذمّت ہی کرتی ہیں، مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات کو چھوڑ کر اسی برحق نظریۂ حیات کی طرف دعوت دیتی ہیں جس کی بنیاد خدا کے حضور انسان کی جوابدہی کے تصوّر پر ہے۔ اور انسان سے یہی مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر ان الٰہی احکام

نہیں ہے کہ اسے علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں ؟[۲۹] لیکن ان کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ

کی پیروی اختیار کرے جو انبیاء علیہم السلام لائے ہیں۔ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نرالی نہیں جو دنیا میں پہلی مرتبہ قرآن ہی پیش کر رہا ہو اور کوئی شخص یہ کہہ سکے کہ تم وہ بات کر رہے ہو جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی نے کبھی نہیں کی۔

یہ آیت منجملہ ان دلائل کے ہے جو امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی اس قدیم رائے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ لے تو نماز ہو جاتی ہے، خواہ وہ شخص عربی میں قرآن پڑھنے کی قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ بنائے استدلال علامہ ابوبکر جصاص کے الفاظ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ارشاد فرما رہا ہے کہ یہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں وہ عربی الفاظ کے ساتھ نہ تھا، لہٰذا کسی دوسری زبان میں اس کے مضامین کو نقل کر دینا اسے قرآن ہونے سے خارج نہیں کر دیتا (احکام القرآن جلد سوم، صفحہ ۴۲۹)۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بالکل ظاہر ہے۔ قرآن مجید ہو یا کوئی دوسری آسمانی کتاب، کسی کے نزول کی کیفیت بھی یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف معانی نبی کے دل پر القا کر دیئے ہوں اور نبی نے پھر انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔ بلکہ ہر کتاب جس زبان میں بھی آئی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معنی اور لفظ دونوں کے ساتھ آئی ہے۔ اس لیے قرآن کی تعلیم جن پچھلی کتابوں میں بھی تھی، انسانی الفاظ میں نہیں، خدائی الفاظ ہی میں تھی، اور ان میں سے کسی کے ترجمہ کو بھی کتاب اللہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اصل کا قائم مقام ٹھیرایا جا سکے۔ رہا قرآن تو اس کے متعلق بار بار بصراحت فرمایا گیا ہے کہ وہ لفظاً لفظاً عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف۔ رکوع ۱) وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (الرعد۔ ۵) قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (الزمر۔ ۳)۔ اور خود اسی آیت زیر بحث سے پہلے مفصلاً فرمایا جا چکا ہے کہ روح الامین اسے زبانِ عربی میں لیکر اترا ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی ترجمہ جو کسی انسان نے دوسری زبان میں کیا ہو وہ بھی قرآن ہی ہوگا اور اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے قائم مقام ہونگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ استدلال کی اس کمزوری کو بعد میں خود امامِ ممدوح نے بھی محسوس فرما لیا تھا، چنانچہ معتبر روایات سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے

**اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصیح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سناتا**

اس مسئلے میں اپنی رائے سے رجوع کر کے امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے قبول کر لی تھی، یعنی یہ کہ جو شخص عربی زبان میں قرأت پر قادر نہ ہو وہ اس وقت تک نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے جب تک اس کی زبان عربی الفاظ کے تلفظ کے قابل نہ ہو جائے، لیکن جو شخص عربی میں قرآن پڑھ سکتا ہو وہ اگر قرآن کا ترجمہ پڑھیگا تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحبین نے یہ رعایت دراصل اُن عجمی نومسلموں کے لیے تجویز کی تھی جو اسلام قبول کرتے ہی فوراً عربی زبان میں نماز ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکتے تھے، اور اس میں بنائے استدلال یہ نہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ بھی قرآن ہے، بلکہ ان کا استدلال یہ تھا کہ جس طرح اشارے سے رکوع و سجود کرنا اُس شخص کے لیے جائز ہے جو رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو اسی طرح غیر عربی میں نماز پڑھنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو عربی تلفظ پر قادر نہ ہو، اور علیٰ ہذا القیاس جس طرح عجز رفع ہو جانے کے بعد اشارے سے رکوع و سجود کرنے والے کی نماز نہ ہوگی اسی طرح قرآن کے تلفظ پر قادر ہو جانے کے بعد ترجمہ پڑھنے والے کی نماز بھی نہ ہوگی۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مبسوط سرخسی جلد اوّل ص ۳۷۔ فتح القدیر و شرح عنایہ علی الهدایہ ج ۱، صفحہ ۱۹۰-۲۰۱۔)

ف ۲۹ یعنی علمائے بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کتبِ آسمانی میں دی گئی تھی۔ اہلِ مکہ خود علمِ کتاب سے ناآشنا سہی، بنی اسرائیل کے اہلِ علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی انوکھا اور نرالا "ذکر" نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمد بن عبداللہ نے لا کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہو بلکہ ہزارہا برس سے خدا کے نبی یہی ذکر پے در پے لاتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ تنزیل بھی اسی رب العٰلمین کی طرف سے ہے جس نے پچھلی کتابیں نازل کی تھیں؟

سیرت ابن ہشام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے زمانۂ نزول سے قریب ہی یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ حبش سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی دعوت سن کر ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجد حرام میں کفارِ قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ حضور نے

تب بھی یہ مان کر نہ دیتے[۱۳۳]۔ اسی طرح ہم نے اس (ذکر) کو مجرموں کے دلوں میں گزارا ہے[۱۳۴]۔ وہ اس پر

جواب میں ان کو قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسی وقت آپ کے رسول برحق ہونے کی تصدیق کر کے آپ پر ایمان لے آئے۔ پھر جب وہ حضورؐ کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل قریش کے چند لوگوں کے ساتھ ان سے ملا اور انہیں سخت ملامت کی۔ اس نے کہا "تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ نامرادو، تمہارے ہاں کے لوگوں نے تو تمہیں اس لیے بھیجا تھا کہ اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ، مگر تم ابھی اس سے ملے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھے"۔ وہ شریف لوگ ابوجہل کی اس زجر و توبیخ پر الجھنے کے بجائے سلام کر کے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے، آپ اپنے دین کے مختار ہیں اور ہم اپنے دین کے مختار، ہمیں جس چیز میں اپنی بہتری نظر آئی اسے ہم نے اختیار کر لیا (جلد دوم۔ صفحہ ۳۲)۔

اسی واقعہ کا ذکر سورۂ قصص میں آیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ، وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ . . . وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (رکوع ۶)

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ انہیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم اس سے پہلے بھی اسی دینِ اسلام پر تھے . . . اور جب انہوں نے بیہودہ باتیں سنیں تو الجھنے سے پرہیز کیا اور بولے ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ پسند نہیں کرتے (کہ چار باتیں تم ہمیں سناؤ تو چار ہم تمہیں سنائیں)"۔

۱۳۳ یعنی اب انہی کی قوم کا ایک آدمی انہیں عربی مبین میں یہ کلام پڑھ کر سنا رہا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، عرب کی زبان سے عربی تقریر ادا ہونے میں آخر معجزے کی کیا بات ہے کہ ہم اسے خدا کا کلام مانیں۔ لیکن اگر یہی فصیح عربی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی غیر عرب پر بطور معجزہ نازل کر دیا جاتا اور وہ ان کے سامنے آ کر نہایت صحیح عربی لہجہ میں اسے پڑھتا تو یہ ایمان نہ لانے کے لیے دوسرا بہانہ تراشتے، اس وقت یہ کہتے کہ اس پر کوئی جن آ گیا ہے جو عجمی کی زبان سے عربی بولتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے

ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ عذاب الیم نہ دیکھ لیں [۳۲] پھر جب وہ بے خبری میں ان پر آپڑے گا اس وقت یہ کہیں گے کیا اب ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے [۳۳]؟

کہ جو شخص حق پسند ہوتا ہے وہ اُس بات پر غور کرتا ہے جو اس کے سامنے پیش کی جارہی ہو اور ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتا ہے کہ یہ معقول بات ہے یا نہیں۔ اور جو شخص ہٹ دھرم ہوتا ہے اور نہ ماننے کا ارادہ کر لیتا ہے وہ اصل مضمون پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اسے رد کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اس کے سامنے بات خواہ کسی طریقے سے پیش کی جائے، وہ بہرحال اسے جھٹلانے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کرے گا۔ کفار قریش کی اس ہٹ دھرمی کا پردہ قرآن مجید میں جگہ جگہ فاش کیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ تم ایمان لانے کے لیے معجزہ دکھانے کی شرط آخر کس منہ سے لگاتے ہو، تم تو وہ لوگ ہو کہ تمہیں خواہ کوئی چیز دکھا دی جائے تم اسے جھٹلانے کے لیے کوئی بہانہ نکال لوگے کیونکہ دراصل تمہیں حق بات مان کر نہیں دینی ہے۔ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ (الانعام - رکوع ۱) "اگر ہم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔" وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ (الحجر - ۱) "اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

[۳۱] یعنی یہ اہل حق کے دلوں کی طرح تسکین روح اور شفائے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اترتا بلکہ ایک گرم لوہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔

[۳۲] ویسا ہی عذاب جیسا وہ قومیں دیکھ چکی ہیں جن کا ذکر اوپر اس سورے میں گزرا ہے۔

[۳۳] یعنی عذاب سامنے دیکھ کر ان کو یقین آئے گا کہ واقعی پیغمبر نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا اور اس وقت

کیا ہمارے عذاب کے لیے یہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا، اگر ہم انہیں برسوں کی مہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آجائے جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامانِ زیست جو ان کو ملا ہوا تھا ان کے کس کام آئے گا؟[۳۴]

(دیکھو) ہم نے کبھی کسی بستی کو اس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اس کے لیے خبردار کرنے والے حقِ نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے۔ اور ہم ظالم نہ تھے[۳۵]

---

یہ حسرت کے ساتھ ہاتھ مل مل کر کہیں گے کہ کاش اب ہمیں کچھ مہلت مل جائے، حالانکہ مہلت کا وقت گزر چکا ہوگا۔

۳۴۔ اس فقرے اور اس سے پہلے کے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑا سا غور کر کے خود بھر سکتا ہے۔ عذاب کے لیے ان کے جلدی مچانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کے آنے کا کوئی اندیشہ نہ رکھتے تھے۔ انہیں بھروسا تھا کہ جیسی چین کی بنسری آج تک ہم بجاتے رہے ہیں اسی طرح ہمیشہ بجاتے رہیں گے۔ اسی اعتماد پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو اور ہم تمہیں جھٹلا کر عذابِ الٰہی کے مستحق ہو رہے ہیں تو لو ہم نے تمہیں جھٹلا دیا، اب لے آؤ اپنا وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے اچھا اگر بالفرض ان کا یہ بھروسہ صحیح ہی ہو، اگر ان پر فوراً عذاب نہ آئے، اگر انہیں دنیا میں مزے کرنے کے لیے ایک لمبی ڈھیل بھی مل جائے جس کی توقع پر یہ پھول رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ جب بھی ان پر عاد و ثمود یا قومِ لوط اور اصحاب الایکہ کی سی کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کی کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے، یا اور کچھ نہیں تو موت ہی کی آخری گھڑی آن پہنچی جس سے بہرحال کسی کو مفر نہیں، تو اس وقت عیشِ دنیا کے یہ چند سال آخر ان کے لیے کیا مفید ثابت ہونگے؟

۳۵۔ یعنی جب انہوں نے خبردار کرنے والوں کی تنبیہ اور سمجھانے والوں کی نصیحت قبول نہ کی اور ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، تو ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا۔ ظلم تو اس وقت ہوتا جب کہ ہلاک کرنے سے پہلے انہیں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہوتی۔

# رسائل و مسائل

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی میراث کا مسئلہ

سوال :- باغِ فدک کے مسئلے پر آپ کی تحقیق کیا ہے ؟ اس کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جیسے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا گیا کیا آنحضورؐ کی میراث میں سے حضرت فاطمہ کا حق نہ دینا خلیفۂ اوّل و دوم کے لیے درست تھا ؟

جواب :- باغِ فدک کے مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا سرکارِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی وفات کے وقت کوئی ذاتی جائداد تھی بھی کہ اس میں میراث جاری ہوتی ؟ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضورؐ کا تمام وقت دعوتِ حق کے کام پر صرف ہونے لگا تھا اور کاروبار تجارت بند ہو چکا تھا۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام رہا اُس اثاثے پر گزر بسر ہوتی رہی جو آپ کے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہلے کا بچا بچایا موجود تھا۔ ہجرت فرمائی تو گویا دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر آپ بالکل بے سروسامان تھے۔ ابتدائی زمانہ انتہائی عسرت اور تنگدستی کے ساتھ گزرا۔ پھر جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اموالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالنے کا حکم دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ جس قدر مناسب سمجھیں اور ضرورت محسوس فرمائیں اپنی ذات پر اور اپنے قرابت داروں کی حاجات پر صرف کرنے کے لیے اِس حصے میں سے لیا کریں، باقی اللہ کے کام میں اور یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کی خبر گیری میں صرف فرمائیں۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (الانفال- آیت ۴۱) یہ پہلا ذریعہ معاش تھا جو آپ کو عطا کیا گیا۔

اس کے بعد ہجرت کے چوتھے سال اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودی قبیلے بنی النضیر پر آپ کو فتح عطا فرمائی اور وہ اپنی جائدادیں چھوڑ کر شہر سے چلے گئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر۔ آیت ۶-۷)

اور جو کچھ دلوایا اللہ نے اُن سے اپنے رسول کو، نہیں دوڑائے اس پر تم نے گھوڑے اور اونٹ، مگر اللہ مسلط کر دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو کچھ دلوا دے اللہ (اس طریقے پر) اپنے رسول کو بستیوں کے لوگوں سے تو وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے تاکہ یہ مال تمہارے دولت مندوں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا رہے۔

اس آیت کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے ان تمام اموال، جائدادوں اور علاقوں کو جو براہِ راست جنگی کارروائی کے ذریعے سے فتح نہ ہوئے ہوں بلکہ اسلامی حکومت کے رعب اور دبدبے سے مسخر ہو جائیں غنیمت سے الگ کر کے حکومت کی ملک قرار دے دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے قرابت داروں کی ضروریات کے لیے اس سرکاری مال میں سے جس قدر مناسب سمجھیں لے لیں۔

ان احکام کے مطابق حضورؐ نے مدینۂ طیبہ میں بنی النضیر کے چھوڑے ہوئے باغوں میں سے چند نخلستان، خیبر میں سے کچھ اراضی، اور فدک میں سے کچھ اراضی اپنے لیے مخصوص کر لی تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی سے حضورؐ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات پوری کرتے تھے، اپنے قرابت داروں کی مدد فرماتے تھے۔ اور جو کچھ بچتا تھا اسے اللہ کی راہ میں صرف فرما دیتے تھے۔

غور کیا جائے تو صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ان دونوں ذرائع (غنیمت اور فے) سے جو کچھ حضورؐ کو

عطا کیا گیا اس کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ آپ نے اپنے ذاتی کاروبار سے کوئی جائداد پیدا کی ہو اور وہ آپ کے بعد بھی آپ کی ملک رہے اور آپ کے وارثوں میں تقسیم ہو، بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپ اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا سارا وقت سرکاری کام پر صرف فرماتے تھے اور اپنا کوئی ذاتی ذریعۂ معاش نہ رکھتے تھے، اس لیے آپ کو یہ حق عطا فرمایا گیا کہ حکومت کی املاک میں سے اتنی جائداد اپنے تصرف میں رکھیں جس سے آپ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے رسول نے نبوت کا یہ کارِ عظیم اپنے لیے جائدادیں اور جاگیریں پیدا کرنے کے لیے تو نہیں کیا تھا۔ یہ تو ایک خدمت تھی جو خالص اللہ کے لیے آپ انجام دے رہے تھے اور اس کا اجر اللہ ہی کے ذمہ تھا۔ ریاست کے مال میں آپ کا حصہ بس اتنا تھا کہ آپ اپنے نفس کے اور اپنے اہل و عیال اور حاجت مند قرابت داروں کے حقوق ادا کر سکیں۔ یہ حصہ آپ کی حیاتِ طیبہ تک ہی باقی رہ سکتا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس کو ذاتی املاک کی طرح وارثوں میں تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بات کو حضورؐ نے خود اپنی زندگی ہی میں صاف کر دیا تھا:

لا تقتسم ورثتی دینارًا ولا درهما، ما ترکت بعد نفقة نسائی و مؤنة عاملی فهو صدقة (بخاری، مسلم، مؤطا، مسند احمد)

میرے وارث کوئی دینار و درہم آپس میں تقسیم نہ کریں۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے، میری بیویوں کا نفقہ اور میرے عامل کا حق الخدمت ادا کرنے کے بعد وہ سب صدقہ ہے۔

لا نورث ما ترکنا فهو صدقة انما یاکل اٰل محمد من هٰذا المال لیس لهم ان یزیدوا علی الماکل (بخاری، مسند احمد، مسلم)

ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ محمدؐ کے گھر والے تو اس مال میں سے بس کھا لیتے ہیں۔ کھانے بھر سے زیادہ لینے کا انہیں حق نہیں ہے۔

ان اللہ عز وجل اذا اطعم نبیاً طعمة ثم قبضه جعله للذی یقوم

اللہ عزوجل کسی نبی کو بسر اوقات کے لیے جو کچھ دیتا ہے وہ اس کی وفات کے بعد اس شخص کے

بعدہٗ ۔ (مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ) حوالے کر دیتا ہے جو اس کا جانشین ہو۔

اس مال کے متعلق حضورؐ کی یہ ہدایات کچھ خفیہ نہ تھیں بلکہ تمام جلیل القدر صحابہ ان کو جانتے تھے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ ہی تنہا ان کے راوی نہیں ہیں۔ حضرت علی، حضرت عباسؓ، عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر، حضرت عثمان، حضرت ابوہریرہ اور تمام ازواج مطہرات کی یہ شہادت نہایت مستند روایات سے ہم تک پہنچی ہے کہ حضور نے اپنے ترکے کی یہی نوعیت بیان فرمائی تھی۔ اس فرمانِ مبارک کے ہوتے کون شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضور کے خلفاء آپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کے معاملہ میں کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے۔

اب دیکھیے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد مطالبۂ میراث کس طرح اُٹھا اور آپ کے خلفاء نے اس پر اپنے اپنے زمانوں میں کیا کارروائی کی۔ شرعی قاعدے کے مطابق میراث کا مطالبہ کرنے کے حق دار تین فریق ہو سکتے تھے۔ ایک سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بیٹی کی حیثیت سے۔ دوسرے حضرت عباسؓ چچا کی حیثیت سے۔ تیسرے جملہ ازواج مطہرات بیویوں کی حیثیت سے۔ ان میں سے پہلے دو فریقوں، یعنی سیدہ فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوبکر کے خلیفہ مقرر ہونے کے فوراً بعد خیبر، فدک اور مدینہ طیبہ کی اُس تمام جائداد کے متعلق، جو حضورؐ کے تصرف میں تھی، اپنا دعویٰ پیش کیا، اور بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ نے استدلال کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ جب تمہاری وفات کے بعد تمہارا ترکہ تمہارے اہل و عیال ہی میں تقسیم ہوتا ہے تو آخر میرے باپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ان کے ترکے میں سے مجھے کیوں میراث نہ ملے؟ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر نے جو کچھ فرمایا وہ یہ تھا:

| | |
|---|---|
| ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا نورث ما ترکنا صدقۃ وقال لست تارکا شیئاً کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل بہ الا عملت بہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں کوئی ایسا کام نہ رہنے دونگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم |

فانی اخشیٰ ان ترکت شیئاً من امرہ ان ازیغ (بخاری، کتاب فرض الخمس، مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ)

کرتے تھے اور میں وہ نہ کروں، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے آپ کے احکام میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

ولکن اعول من کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعولہ وانفق علی من کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینفق علیہ (ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی ترکۃ النبی صلعم۔ مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ)

مگر میں ان سب لوگوں کی عیال داری کروں گا جن کی عیالداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، اور ان سب لوگوں پر خرچ کروں گا جن پر حضور خرچ فرمایا کرتے تھے۔

واللہ لقرابۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احب الی ان اصل من قرابتی (بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر)

خدا کی قسم میرے لیے اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنے کی بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا زیادہ محبوب ہے۔

جناب سیدہ اور حضرت عباس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو کے متعلق جتنی مستند روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ بات کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی مذکور نہیں ہے کہ جناب سیدہؓ یا حضرت عباس نے حضرت ابوبکر کی یہ بات سن کر جواب میں فرمایا ہو کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کر رہے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب حضور کی طرف اس فرمان کی نسبت صحیح تھی تو پھر خلیفۂ رسول کے لیے واجب العمل قانون اس کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا جو رسولِ پاک سے ثابت تھا۔ آخر اس فرمان کی زد صرف جناب سیدہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما ہی کے مفاد پر تو نہ پڑتی تھی۔ خود خلیفہ کی اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مفاد بھی اسی کی لپیٹ میں آجاتا تھا کیونکہ وہ بھی اس کی بنا پر اپنے شوہر کی میراث سے محروم ہوتی تھیں۔ خلیفۂ برحق نے آخر انہی کو اس قانون سے کب مستثنیٰ کیا ہے؟

---

[۱] اس واقعہ کی تفصیل اور مستند روایات کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری، کتاب فرض الخمس۔ کتاب فضائل اصحاب النبی، کتاب المغازی۔ کتاب الفرائض

اب رہ گیا تیسرا فریق یعنی ازواج مطہرات کا گروہ، تو اس نے بھی ارادہ کیا تھا کہ حضرت عثمانؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکر کے پاس بھیجے اور حضورؐ کے ترکے میں سے اپنے آٹھویں حصے کا مطالبہ کرے۔ مگر حضرت عائشہ نے اس کی مخالفت کی اور تمام ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا:

الا تتقین اللہ، الم تعلمن ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول لا نورث ما ترکنا صدقۃ (یرید بذالک نفسہ) انما یاکل ال محمد فی ھذا المال۔

کیا آپ اللہ سے نہیں ڈرتیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے، محمدؐ کے اہل و عیال تو بس اس مال میں سے کھا سکتے ہیں۔

حضرت عائشہ کی یہ بات سن کر سب ازواج مطہرات اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئیں[۱]۔

ایک بات اس سلسلے میں یہ کہی جاتی ہے کہ فدک کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا جائیگا، جناب سیدہ نے حضرت ابوبکر سے خاص طور پر اُسی کا مطالبہ کیا تھا اور شہادت میں حضرت علی اور ام ایمن کو پیش کیا تھا، لیکن حضرت ابوبکر نے ان کی شہادت قبول نہ کی اور فدک کی جائداد ان کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔

مگر یہ قصہ حدیث کی مستند روایات میں سے کسی میں بھی مذکور نہیں ہے۔ البتہ بلاذری اور ابن سعد

---

۴۔ مسلم: کتاب الجہاد، باب حکم الفیٔ

نسائی: کتاب قسم الفیٔ

ترمذی: کتاب السیر، باب ما جاء فی ترکۃ النبی صلعم

مسند احمد، مرویات ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

[۱] بخاری: کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر، کتاب الفرائض، باب قول النبی صلعم لا نورث

مسلم: کتاب الجہاد، باب حکم الفیٔ

مؤطا: باب ما جاء فی ترکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسے نقل کیا ہے، اور ان کے بیان میں بھی کافی اضطراب ہے۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھی بلکہ ام ایمن سے سنی تھی وہی کو شہادت میں پیش کر دیا۔ بخلاف اس کے بلاذری کی روایت یہ ہے کہ جناب سیدہ نے خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ میرے والد نے فدک مجھے دیا ہے۔ پھر ایک روایت کی رو سے انہوں نے حضرت علی اور ام ایمن کو شہادت میں پیش کیا اور دوسری روایت کی رو سے ام ایمن اور رباح (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کو۔[1]

یہ تو ہے اس قصے کی حیثیت باعتبار روایت۔ اب قانونی حیثیت سے دیکھیے تو حضورؐ کا یہ فعل یا تو ہبہ ہو سکتا تھا یا وصیت۔ اگر کہا جائے کہ ہبہ تھا تو وہ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جبکہ حضورؐ نے اپنی زندگی ہی میں فدک کا قبضہ حضرت فاطمہ کو دیدیا ہوتا۔ ورنہ محض زبان سے کسی چیز کو کسی کے لیے نامزد کر دینا اور یہ نیت کرنا کہ وہ چیز مالک کے مرنے کے بعد معطیٰ لہ کو ملے گی، ہبہ نہیں بلکہ وصیت ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ یہ وصیت تھی، تو قرآن مجید میں میراث کا قانون نازل ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود یہ اعلان فرما چکے تھے کہ لا وصیۃ لوارث، "اب ترکے کی تقسیم کے معاملہ میں جن کے حق ثابت کئے گئے ہیں ان کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی"۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے ہی اعلان کردہ قانون کے خلاف دوسرے وارثوں کو چھوڑ کر ایک خاص وارث کے حق میں کوئی وصیت فرمائی ہو گی۔ علاوہ بریں ہبہ یا وصیت کے سوال کو نظر انداز کر کے صرف اس شہادت ہی کو دیکھا جائے جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی تھی تو وہ صریح قرآنی قانونِ شہادت کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ قرآن کی رو سے یا تو دو مردوں کی شہادت معتبر ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت۔ جناب سیدہ (اگر یہ قصہ درست مانا جائے) صرف ایک عورت، یا ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی لائی تھیں۔ اس صورت میں قانون کے خلاف فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ کیا شخصیتوں کو دیکھ کر شہادت کا شرعی نصاب بدل دیا جاتا؟

[1] طبقات ابن سعد، ذکر میراث النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ فتوح البلدان للبلاذری، ذکر فدک۔

اس کے بعد یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دوبارہ اٹھا۔ ان کی خلافت پر دو سال گزر چکے تھے کہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے کا مسئلہ پیش کیا، اور انہوں نے خیبر و فدک کو مستثنیٰ کر کے مدینے والی جائداد دونوں صاحبوں کی تولیت میں اس شرط پر دے دی کہ وہ اس کی آمدنی انہی مصارف میں صرف کریں گے جن میں حضور اپنی حیاتِ طیبہ میں صرف فرمایا کرتے تھے[1]۔ لیکن اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان اس جائداد کے انتظام پر نزاع واقع ہوگئی اور وہ اس قضیے کو لیکر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے۔ اس کا نہایت مفصل قصہ مالکؒ بن اوس بن حدثان کے حوالہ سے تمام معتبر کتب حدیث میں روایت ہوا ہے۔

حضرت مالکؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے حاجب نے آکر عرض کیا کہ عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) حاضری کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی اور وہ تشریف لے آئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر آیا اور اطلاع دی کہ عباس بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہما) تشریف لائے ہیں اور وہ بھی اجازت کے طالب ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اجازت دینے پر دونوں صاحب اندر تشریف لے آئے اور سلام کے بعد بیٹھتے ہی حضرت عباسؓ نے کہا کہ اے امیرالمومنین، میرے اور اس کے (اپنے بھتیجے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) مقدمے کا فیصلہ فرما دیجیے۔ اس کے ساتھ چچا نے بھتیجے کے حق میں کچھ سخت سست الفاظ بھی استعمال کیے۔ دوسرے حاضرین نے کہا واقعی امیرالمومنین، ان کا قضیہ بہت طول کھینچ گیا ہے، آپ انہیں اس جھگڑے سے نجات دلا دیجیے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ٹھیریے۔ میں آپ صاحبوں کو اُس خدا کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے"؟ چاروں صاحبوں نے کہا، ہاں، حضور نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو اسی طرح اللہ کا واسطہ دے کر

[1] بخاری، کتاب فرض الخمس و کتاب المغازی۔ مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب حکم الفیٔ

پوچھا، کیا آپ دونوں صاحب جانتے ہیں کہ حضورؐ نے ایسا اور ایسا فرمایا تھا؟ دونوں نے جواب دیا جی ہاں، واقعی حضورؐ نے یہ فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا، اچھا اب میں آپ لوگوں کو اس معاملے کی حقیقت بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فئے کے معاملے میں اپنے رسول کو وہ مخصوص اختیارات عطا فرمائے تھے جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے۔ پھر سورۂ حشر کی آیت وَمَا اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ آخر تک تلاوت کر کے حضرت عمرؓ نے فرمایا اس آیت کی رو سے یہ اموالِ فئے خالصۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے۔ مگر خدا کی قسم، حضورؐ نے آپ لوگوں کو چھوڑ کر ان سب کو اپنے لیے نہیں سمیٹ لیا اور نہ ان کے معاملے میں کوئی خود غرضی برتی، بلکہ انہیں آپ ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ یہ تین جائدادیں (مدینہ، فدک اور خیبر والی) بچ گئیں۔ ان جائدادوں میں سے حضورؐ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا سال بھر کا نفقہ لے لیتے تھے اور باقی ساری آمدنی انہی کاموں میں صرف فرماتے تھے جن میں اللہ کا مال صرف کیا جاتا ہے۔ یہی حضورؐ کا عمل ان اموال کے معاملے میں زندگی بھر رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کو اللہ کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ یہ بات آپ سب لوگوں کے علم میں ہے؟ چاروں صاحبوں نے جواب دیا جی ہاں۔ پھر حضرت عباس اور حضرت علی سے مخاطب ہو کر کہا، میں آپ دونوں کو بھی اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، آپ یہ بات جانتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، جی ہاں ہم جانتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا، پھر اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا اور ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر کہ اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ولی ہوں، ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے معاملے میں اسی طریقے پر عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں ابوبکرؓ بالکل سچے تھے اور ٹھیک حق کے تابع تھے۔ پھر اللہ نے ابوبکرؓ کو بھی اٹھا لیا اور میں ان کا ولی ہوا۔ میں نے اپنی امارت کے پہلے دو سال تک ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کرتے تھے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں بھی اس میں سچا اور تابعِ حق تھا۔ پھر حضرت علی اور عباس رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر فرمایا، آپ دونوں صاحب میرے پاس آئے اور آپ نے مجھ سے اس جائداد کے معاملے میں گفتگو کی۔

اُس وقت آپ دونوں کے درمیان اتفاق تھا۔ اے عباس آپ نے مجھ سے اپنے بھتیجے کی میراث طلب کی، اور اے علی آپ نے مجھ سے اپنی بیوی کے واسطے سے اُن کے والد کی میراث مانگی میں نے آپ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ، لہٰذا اگر آپ چاہیں تو میں اس شرط پر یہ جائداد آپ کے حوالے کر سکتا ہوں کہ آپ اس میں اسی طرح عمل کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ابوبکر عمل کرتے رہے اور خلیفہ ہونے کے بعد سے میں عمل کر رہا ہوں لیکن اگر یہ شرط آپ کو منظور نہ ہو تو مجھ سے اس معاملہ میں بات نہ کیجیے۔ پھر حضرت عمر نے چاروں صاحبوں کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھا، کیوں حضرات، میں نے اسی شرط پر یہ جائداد ان دونوں اصحاب کے حوالہ کی تھی؟ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر حضرت علی اور حضرت عباس کو بھی اسی طرح خدا کا واسطہ دیکر پوچھا کہ اس جائداد کو حوالے کرتے وقت میری یہی شرط تھی؟ انہوں نے بھی اسے تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے مختلف کوئی فیصلہ کروں۔ اس خدا کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، میں کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کروں گا۔ اگر آپ اس شرط پر عمل نہیں کر سکتے تو یہ جائداد میرے حوالے کر دیجیے میں اس کا انتظام خود کر لونگا۔[1]

یہ ہے اس مسئلے کی پوری تاریخ جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں پیش آئی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ کیا گیا وہ ظلم تھا یا عدل اور حق۔ اس کے ساتھ دو باتیں اور بھی ہیں جو صحیح رائے قائم کرنے کے لیے نگاہ میں رہنی چاہییں۔ اوّل یہ کہ اصل بحث صرف یہ تھی کہ اس جائداد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میراث میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ بحث نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال اور قرابت داروں کو بیت المال سے نفقہ پانے کا حق ہے یا نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے خود اپنی ذات اور اپنے خاندان والوں سے

---

[1] بخاری: کتاب فرض الخمس، کتاب المغازی، کتاب النفقات، کتاب الفرائض، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ مسلم: کتاب الجہاد۔ ترمذی: کتاب السیر، باب ما جاء فی ترکۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ابو داؤد: کتاب الخراج والفئ، باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مسند احمد: مرویات عمر فاروقؓ۔

بدرجہا زیادہ ان حضرات کی خدمت کی، ان کے حق کو ہر دوسرے حق پر مقدم رکھا، اور جو وظائف ان کے لیے جاری کیے وہ خیبر اور فدک اور مدینۂ طیبہ کی جائدادوں کے محاصل سے کہیں بڑھ کر تھے۔ دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے، بلکہ اس مسئلے میں فیصلہ کن ہے، وہ یہ ہے کہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی اس جائداد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث قرار دے کر وارثوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ اسے بدستور وقف فی سبیل اللہ ہی رہنے دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعی میراث ہی تھی تو حضرت علیؓ کے لیے اپنے زمانۂ اقتدار میں وارثوں کو اس سے محروم رکھنا کیسے جائز ہو گیا؟ اسے ظلم ہی کہنے کو کسی کا جی چاہتا ہو تو پھر اسے اتنا انصاف تو کرنا ہی چاہیے کہ جس جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے ان سب کو ظالم کہے۔ ایک ہی فعل پر کسی کے حق میں ایک فیصلہ اور کسی دوسرے کے حق میں دوسرا فیصلہ کرنا حق پرست آدمی کا کام نہیں ہے۔

---

# واقعۂ قرطاس کی تحقیق

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مشہور واقعۂ قرطاس کی اصل نوعیت کیا ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس معاملہ میں کیا موقف ہے؟

جواب: اس واقعہ کے متعلق امام بخاری نے کتاب العلم، کتاب الجزیہ اور کتاب المغازی میں، امام مسلم نے کتاب الوصیۃ میں، اور امام احمد نے مسند ابن عباس میں متعدد روایات مختلف سندوں سے نقل کی ہیں جن کا سلسلہ ابن عباس رضی اللہ عنہ پر تمام ہوتا ہے۔ کسی دوسرے صحابی سے اس باب میں کوئی صحیح روایت منقول نہیں ہوئی ہے۔ خلاصہ ان سب روایات کا یہ ہے کہ وفات سے چار روز پہلے جمعرات کے دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدید تکلیف طاری تھی اور آخری وقت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ اس حالت میں آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ لکھنے کا سامان لاؤ، میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو۔ اس وقت گھر میں بہت سے لوگ جمع تھے۔

حضرت عمرؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سخت تکلیف میں ہیں، ہمارے پاس قرآن موجود ہے، اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔ اس پر اختلاف ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا نہیں، سامانِ کتابت لے آنا چاہیے تاکہ حضور وہ چیز لکھوا دیں جس کے بعد ہم گمراہ نہ ہو سکیں۔ اور بعض اصحاب نے حضرت عمرؓ کے خیال کی تائید کی۔ کچھ اور لوگوں نے کہا کہ حضورؐ سے پھر دریافت کر لو، آپ واقعی کچھ لکھوانا چاہتے ہیں یا یہ بات آپ نے غلبۂ مرض کی وجہ سے گھبراہٹ میں فرمائی ہے[1]۔ اس طرح بعض لوگ آپس میں بحث کرنے لگے اور بعض حضورؐ سے آپ کا مدعا پوچھنے میں لگ گئے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا ذرونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ۔ قوموا عنی ولا ینبغی عندی التنازع۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔" "میرے پاس سے اٹھ جاؤ، میرے پاس جھگڑا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا۔ دوسری یہ کہ جو وفود باہر سے آئیں ان کی اسی طرح خاطر داری کرنا جس طرح میں کرتا تھا۔ اور تیسری بات یا تو حضورؐ ہی کی زبان سے ادا نہ ہوئی یا راوی سے فراموش ہو گئی۔ روایات اس باب میں بھی واضح نہیں ہیں کہ ابن عباسؓ نے اس کو فراموش کیا یا بیچ کے کسی راوی نے۔

یہ ہے کل کائنات اس قصے کی۔ اگر کوئی سیدھے طریقے سے بات سمجھنا چاہے تو اصل صورت معاملہ کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی۔ اپنے محبوب ترین پیشوا اور رہبر کو دنیا سے رخصت ہوتے دیکھ کر سب لوگوں پر اضطراب کا عالم طاری تھا۔ مرض شدت پکڑ چکا تھا۔ سب کی آنکھوں کے

[1] اصل الفاظ ہیں ما شانہ اَھَجَرَ اِستَفھِمُوہُ۔ بعض لوگوں نے غلطی سے اَھجَرَ سمجھ لیا ہے، حالانکہ تمام معتبر روایات میں اَھَجَرَ آیا ہے، یعنی اس میں ہمزہ استفہام کا ہے۔ اور ھجر یھجر کے معنی ہیں وہ باتیں جو مریض غلبۂ مرض کی حالت میں گھبراہٹ کی وجہ سے یا بے حواسی کے عالم میں کرتا ہے۔ نیز یہ قول کسی روایت میں بھی حضرت عمرؓ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ہے بلکہ قالوا کے ساتھ منقول ہوا ہے یعنی جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے بعض نے یہ کہا

سامنے حضور سخت کرب کی حالت میں مبتلا تھے۔ ابن عباس کا اپنا حال یہ تھا کہ اس واقعہ کے سالہا سال بعد ایک روز شاگردوں کے سامنے ان کی زبان پر جمعرات کا لفظ آیا اور یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ شاگردوں نے پوچھا جمعرات کا کیا قصہ ہے جسے یاد کر کے آپ یوں بدحال ہوئے جا رہے ہیں۔ فرمایا وہ دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت تکلیف کا تھا (اشتد بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ)۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عین اُس وقت جبکہ حضور پر یہ حالت طاری تھی، آپ کے جاں نثار خادموں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس حالت میں قلم دوات منگوانے کے لیے حضور نے ارشاد فرمایا اور غرض یہ بیان فرمائی کہ ایسی کوئی چیز لکھو دیں جس سے امت بعد میں گمراہ نہ ہونے پائے۔ مرض کی شدت میں ممکن ہے کہ بات صاف بھی زبانِ مبارک سے ادا نہ ہوئی ہو۔ اسی وجہ سے بعض حاضرین کو شبہ ہوا کہ گھبراہٹ میں آپ نے کچھ فرمایا ہے جسے پھر پوچھ کر تحقیق کرنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر جو کچھ کہا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ "حضور اس وقت سخت تکلیف میں مبتلا ہیں، اس حالت میں آپ امت کے لیے فکرمند ہو رہے ہیں اور کچھ لکھوانے کی زحمت اٹھانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ آپ کے بعد گمراہ نہ ہونے پائیں، لیکن اس وقت آپ کو یہ زحمت دینی مناسب نہیں ہے، امت کی ہدایت کے لیے قرآن موجود ہے، انشاء اللہ وہی گمراہی سے بچانے کے لیے کافی ہوگا"۔ ممکن ہے اس کے ساتھ حضرت عمر کو یہ بھی اندیشہ ہو کہ اگر تحریر لکھواتے لکھواتے حضور کا وقت آن پورا ہوا اور بات ادھوری رہ گئی تو کہیں وہ الٹی فتنے ہی کی موجب نہ بن جائے۔ بہر حال یہ بالکل فطری امر تھا کہ اُس موقع پر کوئی علم اور ہدایت کی حرص میں اس بات کا طالب ہوا کہ حضورؐ سے ضرور کچھ لکھوا لیا جائے، اور کسی نے محبت کی وجہ سے بھی اور دُور اندیشی کی بنا پر بھی آپ کو یہ زحمت دینا مناسب نہ سمجھا، اور کوئی اس شک میں پڑ گیا کہ حضورؐ واقعی کچھ لکھوانا ہی چاہتے ہیں یا شدتِ مرض کی وجہ سے گھبراہٹ میں کچھ فرما رہے ہیں۔ ان تینوں قسم کے لوگوں میں سے کسی کی بات بھی ایسے موقع پر نہ تو خلافِ توقع ہی تھی اور نہ اسے نامناسب ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ حضورؐ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے آیا اس کی نوعیت عام نصائح کی سی تھی، یا کسی ایسے اہم حکم کی جسے ثبت کرا دینا امت کی ہدایت کے لیے ضروری تھا، تو اس کا فیصلہ بعد کے واقعات

نے خود ہی کر دیا۔ حضورؐ اس واقعہ کے بعد بھی چار دن تک زندہ رہے۔ ان دنوں میں مرض کی شدت کا حال بھی یکساں نہیں رہا۔ اور اس زمانے میں وہی سب لوگ آپ کے پاس بیٹھے بھی نہیں رہے جو جمعرات کے دن اُس وقتِ خاص پر موجود تھے بلکہ اس مدت میں آپ کو مسجدِ نبوی میں تشریف لے جانے اور جماعتِ صحابہ سے خطاب کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اگر واقعی کوئی اہم حکم ایسا ہوتا جسے ضبطِ تحریر میں لانا ضروری تھا تو حضورؐ اِن دنوں میں کسی وقت بھی اپنے کاتبوں میں سے، یا خود اہلِ بیت میں سے کسی کو بلا کر اُسے لکھوا سکتے تھے یا زبانی ارشاد فرما سکتے تھے۔ اس سے حضرت عمرؓ کے موقف کی صحت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ٹھیک سمجھا تھا کہ شدتِ مرض میں امّت کی فلاح کے لیے حضورؐ فکر مند ہو رہے ہیں اور کچھ نصائح لکھوانا چاہتے ہیں، کسی بنیادی مسئلے کا فیصلہ لکھوانا اِس حالت میں پیشِ نظر نہیں ہے، اس لیے اس تکلیف اور کرب کے عالم میں حضورؐ کو یہ زحمت دینا ٹھیک نہیں، ہمیں قلم دوات لانے کے بجائے حضورؐ کو یہ اطمینان دلانا چاہیے کہ آپ ہمارے لیے پریشان نہ ہوں، آپ اپنی امت کو وہ کتاب ہدایت دے کر جا رہے ہیں جو انشاءاللہ اسے کبھی گمراہ نہ ہونے دیگی۔

آخر میں حضرت علیؓ کی بھی ایک روایت ملاحظہ فرمالی جائے جسے مسند احمد میں نقل کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اٰتیہ بطبق یکتب فیہ ما لا تضل امتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ من بعدہ، قال فخشیت ان تفوتنی نفسہ قال قلت انی احفظ واعی قال اوصی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ | مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ شانے کی ایک ہڈی لے آؤں تاکہ آپ اس میں ایک ایسی چیز لکھ دیں جس سے آپ کی امت آپ کے بعد گمراہ نہ ہونے پائے۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کے لانے لاتے آپ کی وفات نہ ہو جائے اس لیے میں نے عرض کیا آپ فرمائیں میں یاد رکھوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا میں وصیت کرتا ہوں نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرنے کی اور ان غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی جو تمہاری ملک میں ہوں۔ |

# ابوجہل کی بیٹی سے حضرت علیؓ کے پیغام نکاح کا معاملہ

سوال: اسلام میں جب چار شادیوں کی اجازت ہے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے دوسری شادی کرنی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کیوں روک دیا؟ ابوجہل کی بیٹی کے خانوادۂ اہل بیت میں آجانے سے اگر کوئی خطرہ تھا تو کیا حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے حرم رسالت میں داخل ہونے سے وہی خطرہ نہ تھا؟

جواب: اس واقعہ کو امام زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہ اور ابو ملیکہ نے حضرت مسور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے، اور اس کی تائید حضرت عبداللہ بن زبیر کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ نیز ابوحنظلہ اور سوید بن غفلہ کی مرسل روایات بھی اس کی مؤید ہیں۔ امام بخاری نے کتاب فرض الخمس، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ اور کتاب النکاح میں، مسلم نے کتاب فضائل الصحابہ میں، ابوداؤد نے کتاب النکاح میں، ابن ماجہ نے بھی کتاب النکاح میں، ترمذی نے کتاب المناقب میں اور حاکم نے کتاب معرفۃ الصحابہ میں متعدد سندوں سے ان روایات کو نقل کیا ہے۔

تفصیل اس قصے کی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ابوجہل کا خاندان مسلمان ہو گیا تو حضرت علیؓ نے اس کی بیٹی سے (جس کا نام کسی نے جویریہ، کسی نے عوراء اور کسی نے جمیلہ بیان کیا ہے) نکاح کرنا چاہا۔ لڑکی کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی پر بیٹی نہ دیں گے جب تک آپ سے پوچھ نہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ذکر حضورؐ سے کیا۔ ایک روایت کی رو سے خود حضرت علی نے بھی اشارۃً کنایۃً حضورؐ سے اجازت طلب کی۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان باتوں کا چرچا سن لیا اور جا کر اپنے والد ماجد کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ کی قوم کے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ کو اپنی بیٹیوں کی پروا نہیں ہے، دیکھیے، یہ علی اب ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے والے ہیں۔" اس پر حضورؐ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

ان بنی ھشام بن المغیرۃ استاذنونی   بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اس بات کی اجازت

ان ینکحوا ابنتھم علی بن ابی طالب فلا اذن ثم لا اذن ثم لا اذن الا ان یرید ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی وینکح ابنتھم فانما ھی بضعۃ منی یریبنی ما ارابھا ویؤذینی ما آذاھا۔

مانگی ہے کہ وہ اپنی بیٹی علی بن ابی طالب کے نکاح میں دیں۔ میں اس کی اجازت نہیں دیتا، نہیں دیتا۔ نہیں دیتا۔ الّا یہ کہ ابوطالب کا بیٹا میری لڑکی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح کرے۔ میری لڑکی میرا ٹکڑا ہے۔ جو کچھ اسے ناگوار ہوگا وہ مجھے ناگوار ہوگا، اور جو چیز اسے تکلیف دیگی وہ مجھے تکلیف دیگی۔

وانی لست احرم حلالا ولا احل حراما ولکن واللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ وبنت عدو اللہ ابداً۔

میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا۔ مگر خدا کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔

(وفی روایۃ) ان فاطمۃ منی وانا اتخوف ان تفتن فی دینھا

(ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا) فاطمہ مجھ سے ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں اپنے دین کے معاملہ میں فتنے میں نہ پڑ جائے۔

اس واقعہ پر آدمی کو یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی شادیاں کیں اور عام لوگوں کو بھی چار تک بیویاں بیک وقت رکھنے کی اجازت دی، مگر خود اپنی بیٹی پر ایک سوکن کا آنا بھی آپ نے گوارا نہ کیا۔ سوکن کے آنے سے جو اذیت آپ کی بیٹی کو، اور بیٹی کی خاطر خود آپ کو ہو سکتی تھی، وہی اذیت دوسری عورتوں اور ان کے ماں باپ کو بھی تو لاحق ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اپنے حق میں تو اسے برداشت نہ کیا اور دوسروں کے حق میں اسے جائز رکھا۔

بظاہر یہ ایک سخت اعتراض ہے اور معاملے کی سادہ صورت دیکھ کر آدمی بڑی الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ ایک عورت کا شوہر اگر دوسری بیوی لے آئے تو اس عورت کو فطرتاً یہ ناگوار ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی اس سے اذیت ہوتی ہے۔ شریعت نے

ایک سے زیادہ نکاحوں کی اجازت اس مفروضے پر نہیں دی ہے کہ یہ چیز اُس عورت کو اور اس کے رشتہ داروں کو ناگوار نہیں ہوتی جس پر سوکن آئے۔ بلکہ اس امر واقعہ کو جانتے ہوئے شریعت نے اسے اس لیے حلال کیا ہے کہ دوسری اہم تر اجتماعی اور معاشرتی مصلحتیں اس کو جائز کرنے کی متقاضی ہیں۔ شریعت یہ بھی جانتی ہے کہ سوکنیں بہر حال سہیلیاں اور شوہر شریک بہنیں بن کر نہیں رہ سکیں۔ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ کشمکش اور چپقلش ضرور ہوگی اور خانگی زندگی تلخیوں سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ لیکن یہ انفرادی قباحتیں اُس عظیم تر اجتماعی قباحت سے کم تر ہیں جو یک زوجی کو بطور قانون لازم کرنے سے پورے معاشرے میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے تعدد ازواج کو حلال قرار دیا ہے۔

اب دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں کیا پیچیدگی واقع ہوتی ہے۔ شرعاً آپ کی بیٹی پر بھی سوکن لانا آپ کے داماد کے لئے حلال تھا۔ اسی وجہ سے حضرت علیؓ نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اسی وجہ سے حضور نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان کے لیے یہ فعل حرام ہے۔ بلکہ آپ نے خود تصریح فرمائی کہ میں حلال کو حرام نہیں کرتا۔ لیکن یہاں حضور کی ایک ہی شخصیت میں دو مختلف حیثیتیں جمع تھیں۔ ایک حیثیت میں آپ انسان تھے اور فطرتاً یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کی صاحبزادی کے گھر میں سوکن آنے سے جو تلخی پیدا ہو اس کا تھوڑا یا بہت اثر آپ کی طبیعت پر نہ پڑے۔ دوسری حیثیت میں آپ اللہ کے رسول تھے اور رسول کی حیثیت سے آپ کا مقام یہ تھا کہ آپ کے ساتھ اگر کسی شخص کے تعلقات خراب ہو جائیں اور کوئی شخص آپ کے لیے موجبِ اذیت ہو جائے تو اس کے دین و ایمان کی بھی خیر نہ تھی۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے حضرت علیؓ کو بھی اور بنی ہشام بن مغیرہ کو بھی اس کام سے روک دیا۔ کیونکہ اگرچہ شرعاً یہ حلال تھا۔ مگر اس کے کرنے سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ چیز حضرت علیؓ اور ان کی دوسری بیوی اور اس کے خاندان والوں کے ایمان اور ان کی عاقبت کو خطرے میں ڈال دیگی۔

ایک اور بات جس کا حضورؐ نے اپنے خطبے میں ذکر فرمایا وہ یہ تھی کہ بنی ہشام بن مغیرہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن رہ چکے تھے اور فتح مکہ کے بعد تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے خود اس لڑکی کے باپ ابوجہل کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی دشمنی میں وہ تمام کفار سے

بازی لے گیا تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جنگِ بدر میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا خاندان برسوں اس کے جذبۂ انتقام میں تڑپتا رہا۔ اب اگرچہ یہ لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن یہ تحقیق ہونا ابھی باقی تھا کہ یہ قبولِ اسلام واقعی پورے اخلاص اور قلب کی مکمل تبدیلی کا ثمرہ ہے یا محض شکست کا نتیجہ۔ اس حالت میں اس خاندان کی لڑکی، اور وہ بھی خاص ابوجہل کی بیٹی کا اُس گھر میں سوکن بن کر پہنچ جانا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ملکۂ بیت تھیں، بڑے فتنوں کا سبب بن سکتا تھا۔ ان لوگوں کی تالیفِ قلب تو کی جا سکتی تھی اور کی بھی گئی، لیکن اسلام کے ساتھ ان کے تعلق کا حال جب تک ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو جائے، انہیں عین خاندانِ رسالت میں گھسا لانا اور خود رسولِ اکرمؐ کی صاحبزادی کے بالمقابل لا کھڑا کرنا سخت نامناسب اور پُرخطر تھا۔ اس وجہ سے بھی حضورؐ نے اس رشتے کو ناپسند فرمایا اور علی الاعلان کہا کہ خدا کے رسولؐ کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتی۔ نیز اس بات کی طرف بھی آپ نے اشارہ فرما دیا کہ اس سے "فاطمہؓ کے فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کو اپنے بیاہ شادی کے معاملے میں (اگرچہ وہ بجائے خود حلال ہی سہی) ایسی آزادی نہیں دی جا سکتی جس سے ایک پوری ملت کے لیے فتنہ و شر کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

بے شک یہاں یہ اعتراض اُٹھ سکتا ہے کہ ابوجہل کے خاندان سے ابوسفیان کا خاندان اسلام کی عداوت میں کچھ کم نہ تھا، پھر اگر ابوجہل کے خاندان کی لڑکی کا خانوادۂ رسالت میں آنا موجبِ فتنہ ہو سکتا تھا تو ابوسفیان کی صاحبزادی (حضرت ام حبیبہؓ) کا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں شامل ہو جانا کیوں خطرے سے خالی تھا؟ لیکن دونوں کے حالات کا فرق نگاہ میں ہو تو یہ اعتراض آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوجہل کی لڑکی اور ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کا سرے سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ ابوجہل کی لڑکی اور اس کے چچا اور بھائی، سب کے سب فتحِ مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ ان کے بارے میں یہ امتحان ہونا ابھی باقی تھا کہ ان کا ایمان کس حد تک اخلاص پر مبنی ہے اور کہاں تک اس میں شکست خوردگی کا اثر ہے۔ بخلاف اس کے حضرت ام حبیبہؓ اُس بڑے سے بڑے امتحان سے گزر کر، جو اکابرِ صحابہ میں سے بھی کم ہی کسی کو پیش آیا تھا، اپنے کمال

اخلاص اور اپنی صداقتِ ایمانی کا پورا ثبوت دے چکی تھیں۔ انہوں نے دین کی خاطر وہ قربانیاں کی تھیں جن کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور نظر آسکتی ہے۔ ذرا غور کیجیے۔ ابوسفیان کی بیٹی، ہندبنت عتبہ (مشہور ہند جگرخوار) کی لختِ جگر، جس کی پھوپھی وہ عورت تھی جسے قرآن میں حمالۃ الحطب کا خطاب دیا گیا ہے، جس کا نانا عتبہ بن ربیعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دشمن تھا۔ اس خاندان سے اور اس ماحول سے نکل کر وہ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ سے بھی پہلے ایمان لاتی ہیں، اپنے شوہر کو مسلمان کرتی ہیں، خاندان والوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ ہجرت کر جاتی ہیں، حبش جاکر شوہر عیسائی ہو جاتا ہے اور وہ دین کی خاطر اس کو بھی چھوڑ دیتی ہیں، غریب الوطنی کی حالت میں تن تنہا ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ رہ جاتی ہیں اور ان کے عزمِ ایمانی میں ذرہ برابر تزلزل نہیں آتا۔ کئی برس اس حالت میں جب گزر جاتے ہیں اور ایک بے سہارا خاتون دیارِ غیر میں ہر طرح کے مصائب جھیل کر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ دین کو جس پائے کا خلوص، جس مرتبے کی سیرت اور جس درجے کا کردار مطلوب ہے وہ سب یہاں موجود ہے، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ انتخاب ان پر پڑتی ہے اور آپ حبش ہی میں ان کو نکاح کا پیغام بھیجتے ہیں۔ غزوۂ خیبر کے بعد وہ حبش سے واپس آکر حرمِ نبوی میں داخل ہوتی ہیں۔ اس کے تھوڑی ہی مدت بعد قریش صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب مکے پر چڑھائی کر دیں گے۔ اس موقع پر ابوسفیان صلح کی بات چیت کے لیے مدینے آتا ہے اور اس امید پر بیٹی کے ہاں پہنچتا ہے کہ اس کے ذریعہ صلح کی شرائط طے کرنے میں سہولت ہو گی۔ برسوں کی جدائی کے بعد پہلی مرتبہ باپ سے بیٹی کو ملنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرش پر بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو بیٹی فوراً یہ کہہ کر فرش اٹھا لیتی ہے کہ رسول کے فرش پر ایک دشمنِ اسلام نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسی خاتون کا خانوادۂ رسالت میں داخل ہونا تو ہیرے کا ہار میں ٹھیک اپنی جگہ پا لینا تھا۔ اس سے کسی فتنے کے رونما ہونے کا کوئی بعید ترین امکان کیا، وہم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ البتہ اس لڑکی کا اس خاندان میں آنا ضرور فتنے کے امکانات اپنے اندر رکھتا تھا جسے اور جس کے خاندان کو صرف فتح نے اسلام میں داخل کیا تھا اور اسلام میں

آئے ہوئے جس کو ابھی صرف چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ اُسی کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے اثرات سے اس کا اور اس کے خاندان والوں کا دل پوری طرح پاک ہوا ہے یا نہیں۔

---

## کیا صحابہ کرام حضورؐ کی تجہیز و تکفین چھوڑ کر خلافت کی فکر میں لگے رہے؟

سوال: صحابہ کرام اور خاص طور پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن دفن میں شریک نہ ہوئے اور خلافت و بیعت کے مسئلے میں اُلجھے رہے۔ حضورؐ کے غسل اور کفن دفن میں شریک ہونا کتنی بڑی سعادت تھی اور خود محبتِ رسولؐ کا کیا تقاضا تھا؟

جواب:۔ یہ قصہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ بے گور و کفن پڑا تھا اور صحابہ کرام حضورؐ کی تجہیز و تکفین کی فکر چھوڑ کر خلافت کی فکر میں پڑ گئے، درحقیقت بالکل ہی ایک بے سروپا داستان ہے۔ اصل واقعات یہ ہیں کہ حضورؐ کی وفات پیر کے روز شام کے قریب ہوئی۔ بخاری و مسلم میں حضورؐ کے خادمِ خاص انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے "آخرِ یوم" کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ سانحہ عظیم عصر و مغرب کے درمیان پیش آیا تھا۔ فطری بات ہے کہ اس سے پوری جماعتِ اہلِ ایمان کے ہوش پراگندہ ہو جانے چاہییں تھے، چنانچہ یہی ہوا۔ حضرتِ عمرؓ کو تو یہی یقین نہ آتا تھا کہ سرورِ عالم واقعی وفات پا گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے آکر جب تقریر کی تو لوگوں کو پوری طرح یہ یقین ہوا کہ وہ ناگزیر بات جو پیش آنی تھی پیش آچکی ہے۔ اتنے میں رات آگئی۔ یہ ممکن اور مناسب نہ تھا کہ راتوں رات تجہیز و تکفین کر کے حضورؐ کو دفن کر دیا جاتا، کیونکہ جنازے میں شرکت کی سعادت سے محروم رہ جانا اُن ہزاروں مسلمانوں کو ناگوار ہوتا جو مدینۂ طیبہ اور اس کی نواحی بستیوں میں رہتے تھے۔ لازماً ان کو شکایت ہوتی کہ آپ لوگوں نے ہمیں آخری دیدار اور نمازِ جنازہ کا موقع بھی

نہ دیا۔ اس لیے رات بہرحال گزارنی تھی۔ اس رات صحابہ کے مختلف گروہ اپنی اپنی جگہ جمع ہو کر سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ ازواجِ مطہرات حضرت عائشہؓ کے ہاں گریہ و زاری میں مشغول تھیں جہاں حضورؐ نے وفات پائی تھی۔ حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور دوسرے قرابت داران رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے گھر میں جمع تھے۔ مہاجرین کی ایک اچھی خاصی تعداد حضرت ابوبکرؓ کے پاس غمگین و متفکر بیٹھی تھی۔ انصار کے مختلف گروہ اپنے اپنے قبیلوں کی چوپالوں (سقیفہ کے اصل معنی چوپال ہی کے ہیں) میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے آکر خبر دی کہ بنی ساعدہ کی چوپال میں انصار کا ایک بڑا گروہ جمع ہے اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا مسئلہ چھڑ گیا ہے۔ حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ، جو حضورؐ کے بعد مسلمانوں کی جماعت میں "بڑے" (SENIOR) سمجھے اور مانے جاتے تھے، یہ خبر سن کر فکرمند ہوئے کہ ابھی سردارِ ملت کی آنکھ بند ہوئی ہے، ساری امت اس وقت بے سر ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بڑا فتنہ کھڑا ہو جائے اور جماعت کا نظم از سرِ نو قائم ہونے سے پہلے ہی بدنظمی اپنے قدم جما لے۔ اس لیے یہ تینوں حضرات فوراً برسرِ موقع پہنچ گئے اور راتوں رات انہوں نے حضورؐ کی جانشینی کے مسئلے کو، جو ایک فتنہ خیز صورت میں سطے ہونا چاہتا تھا، اس صحیح شکل میں سلجھا لیا جس کے صحیح ہونے پر تاریخ اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر چکی ہے۔ یہ سارا واقعہ اسی رات کا ہے جس کی شام کو حضورؐ کی وفات ہوئی تھی۔ رات کو بہرحال حضورؐ کی تجہیز و تکفین نہیں کرنی تھی جس کی مصلحت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اسی رات میں خلافت کا مسئلہ طے کیا گیا۔ صبح سویرے مسجد نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان ہوا، مہاجرین و انصار سب نے اسے قبول کر کے جماعت کا نظام بحال کر دیا اور اس کے بعد بلاتاخیر حضورؐ کی تجہیز و تکفین کا کام شروع ہو گیا۔

یہ کہنا بالکل خلافِ واقعہ ہے کہ صحابہ کرام اپنی خلافت کی فکر میں لگے رہے اور حضورؐ کی تجہیز و تکفین بس آپ کے اہل بیت نے کی۔ یہ تجہیز و تکفین کسی نے بھی پیر اور منگل کی درمیانی شب میں نہ کی تھی۔ اس کا آغاز منگل کی صبح کو اس وقت ہوا ہے جبکہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہو چکی تھی۔ اور یہ کام

حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ہوا ہے جس کا ایک دروازہ اسی مسجدِ نبوی میں کھلتا تھا جہاں مدینہ طیبہ کے سارے صحابہ جمع تھے، جہاں گرد و نواح کے لوگ وفات کی خبر سن سن کر چلے آ رہے تھے، اور جہاں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی تھی۔ جن لوگوں کو کبھی مسجدِ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حجرۂ عائشہؓ (جس میں سرکارؐ مدفون ہیں) اور مسجدِ نبوی کا مکانی تعلق کیا ہے وہ یہ بات سن کر ہنس دیں گے کہ صحابہ مسجدِ نبوی میں اپنی خلافت کی فکر میں لگے ہوئے تھے اور بے چارے اہلِ بیت حجرۂ عائشہ میں حضورؐ کی تجہیز و تکفین کر رہے تھے۔ غلط بات تصنیف کرنی بھی ہو تو اس کے لیے کم از کم کچھ سلیقہ تو چاہیے۔

یہ بات کہ حضورؐ کو غسل و کفن صرف آپ کے اہلِ بیت نے دیا، یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اس خدمت کو انجام دینے والے حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، فضلؓ بن عباس، قثمؓ بن عباسؓ، اسامہ بن زید اور شقرانؓ (حضورؐ کے آزاد کردہ غلام) تھے، اور انہوں نے اس خیال سے حجرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا کہ لوگوں کا ہجوم باہر زیارت کے لیے بے چین کھڑا تھا، اگر دروازہ کھلا رہنے دیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ زیادہ لوگ اندر آ جائیں گے اور کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر بھی انصار نے جب شور مچایا کہ ہمیں بھی تو اس سعادت میں حصہ ملنا چاہیے تو ان میں سے ایک صاحب (اَوس بن خَولِی) کو اندر بلا لیا گیا۔ کفن پہنانے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ حضورؐ کے لیے قبر کہاں تیار کی جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حدیث پیش کی کہ مَا قُبِضَ نَبِیٌّ اِلَّا دُفِنَ حَیْثُ یُقْبَضُ (نبی کا انتقال جہاں ہوتا ہے وہیں اس کو دفن کیا جاتا ہے) اور اسی پر فیصلہ ہوا کہ حجرۂ عائشہ ہی میں آپ کے لیے قبر تیار کی جائے۔ حضرت ابوطلحہؓ زید بن سہل انصاری نے قبر کھودی۔ پھر لوگوں نے گروہ در گروہ اندر جا کر نماز جنازہ پڑھنی شروع کی اور دیر تک مسلسل یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو نصف شب کے قریب دفن کی نوبت آئی۔ معلوم نہیں کہ اس پوری مدت میں آخر وہ کونسا وقت تھا جب صرف حضورؐ کے اہلِ بیت بے یار و مددگار آپ کے جسدِ اطہر کو لیے بیٹھے رہے اور صحابہؓ کرام اپنی خلافت کی فکر میں مشغول رہے؟

---

# تعارفِ کتب

(عبد الحمید صدیقی)

**تہذیبی بحران** (THE CRISIS OF CIVILIZATION) ہمارے اس عہد میں تہذیبِ جدید کے جس قدر ناقدانہ جائزے لیے گئے ہیں اُن میں یہ جائزہ بڑا ہی صحیح اور بے لاگ ہے۔ اس کتاب کے مصنف الفرڈ کابن لندن یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے متعلق ہیں۔ انہوں نے تہذیبِ جدید کی ناکامیوں کو بیان کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑی دیدہ وری سے اُن اسباب کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جنہوں نے اس تمدن کو اس نوبت تک پہنچایا ہے۔

انہوں نے سب سے پہلے جنگوں کی مختلف نوعیتوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے بے شمار پہلو ہیں بعض جنگیں وہ ہیں جو محض اپنی برتری اور تفوق جتانے کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ ان میں آدمی تو بلاشبہ کام آتے ہیں، مگر ان میں کوئی تہذیب، کوئی نظامِ حیات تباہ و برباد نہیں ہوتا لیکن جنگ کی ایک قسم وہ ہے جو نظریاتی تصادم کا مظہر ہوتی ہے اور جس کا مقصد ایک تہذیب و تمدن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک نیا نظامِ معاشرت تعمیر کرنا ہے۔ فاضل مصنف پھر اپنے عہد کی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان کے محرکات نہایت گہرے ہیں اور ان کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مقصد اس موجودہ نظام کو مٹا کر ایک نئے نظام کی تخلیق ہے۔

اسی ضمن میں انہوں نے ایک بات نہایت ہی پتے کی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دَور کا انسان پہلے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ قسّی القلب اور بے حس ہو گیا ہے اور اسی لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر بالکل وحشیوں کی طرح لڑ رہا ہے۔ آج بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، باپ بیٹے کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ اس تصادم میں نہ کوئی اصول مدِ نظر ہے اور نہ کوئی اخلاقی قدر سامنے ہے محض وحشیانہ قوت انسان کی رہنما بن کر اسے ایک دوسرے سے لڑوا رہی ہے۔

پھر انہوں نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ لڑنے جھگڑنے کا کام گو انسان پہلے بھی کرتا رہا ہے

لیکن اس نے آج سے پہلے کبھی مقصدِ حیات کی صورت اختیار نہ کر رکھی تھی۔ اخلاق کے بندھن ٹوٹنے اور انسانی قدروں کے پامال ہونے کے بعد اب جنگ و جدل حیاتِ انسانی کی غایتِ اولیٰ قرار پائی ہے۔ چنانچہ کتاب کے مصنف لکھتے ہیں :۔

"اخلاقی گرفت کے ہٹ جانے سے جنگ اپنی ذات میں ایک مقصد اور جارحیت حیاتِ انسانی کا نصب العین قرار پا چکی ہے۔ عہدِ حاضر کی مسموم فضا میں بین الاقوامی قانون ایک ایسا بیمار بچہ ہے جس نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی ہے اور بزمِ اقوام کو ایک گلدستہ کی حیثیت سے اس کی قبر پر چڑھایا گیا ہے۔"

اسی جنگی کیفیت نے کلیت پسند ریاستوں کے وجود کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ جب کسی قوم کے اندر ایک مستقل ڈر اور خوف کا احساس موجود رہے تو اُس کے افراد اپنے تحفظ و بقا کے لیے اپنے حقوق سے از خود دستبردار ہو کر اپنے گلے میں آمریت کا طوق پہن لیتے ہیں۔ فاضل مصنف اسی پہلو پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"جدید جنگ لڑنے کے لیے — خواہ اُس میں کامیابی ہو یا ناکامی — ایک ضروری چیز یہ ہے کہ زندگی کے سارے شعبوں کو براہِ راست حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ جب ملک میں معاشی حالات دگرگوں ہو جائیں اور اضطراب دن بدن بڑھے تو ریاست کا کنٹرول لابدی ہو جاتا ہے۔ کلیت پسندی انتخاب و اختیار کا معاملہ نہیں رہتا بلکہ یہ ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر حکومت اپنے اقتدار میں اضافہ کرنے کے لیے قوم کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے منصوبے بناتی رہتی ہے۔"

پھر دورِ جدید میں جنگ کا آغاز مفادات کے تصادم سے نہیں ہوتا بلکہ محض جذبات کی شعلہ فشانیاں اسے شروع کرتی ہیں۔ نیشنلزم کی بدمستی جو موجودہ قتل و غارت کی اصل بنیاد ہے، صرف جذبات کی پیداوار ہے۔ اس کے پیچھے کوئی عقل کام نہیں کرتی۔ قومیت پرستی کی خام خیالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتا ہے :۔

دنیشلزم سے مراد یہ احساس ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو سیاسی آزادی کا حق حاصل ہے۔ یہی احساس پھر آگے بڑھ کر یہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ قوم کا حق سب پر غالب ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ افراد کے مفادات ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جلد ہی ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب ایک قوم داخلی طور پر کلیت پسند بن جاتی ہے اور خارجی معاملات میں وہ اپنے حقوق کا تفوق دنیا کی دوسری ساری اقوام پر جتانا شروع کر دیتی ہے اور اس امر کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ وہ سب اسے تسلیم کر لیں۔ یہیں سے استعمار پرستی کی لعنت جنم لیتی ہے ... اور معصوم نیشلزم خونخوار امپریلزم کا روپ دھارتا ہے۔"

نیشلزم کے دیوا ستبداد نے ہمارے اس عہد میں سفاکی، آدم بیزاری، زبردست آزادی کی جو مختلف صورتیں اختیار کر رکھی ہیں یہ ایک ایسی دل فگار داستان ہے جس سے آج کوئی انسان ناواقف نہیں۔ لیکن اس نے انسانی اخلاق پر جو اثرات مرتب کیے ہیں وہ انسانیت کے بقا کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قومیت پرستی جس احساس کی انسان کے دل و دماغ میں آبیاری کرتی ہے وہ یہ ہے کہ میری قوم جو کچھ کرے وہی صحیح اور برحق ہے اور وہی دنیا کا اصلی اور حقیقی اخلاقی معیار ہے۔ اس تصور نے اخلاقی اقدار کی ایسی مٹی پلید کی ہے کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اخلاق کے وہ معیار جو معروضی تھے اور جن کی مدد سے ہم کسی فعل کے حق اور ناحق ہونے کا فیصلہ کرتے تھے اب بدل چکے ہیں۔ اُن کی حیثیت اب ایک معیار اور پیمانے کی نہیں رہی بلکہ وہ اب ایسے نیاز مند قسم کے خدام بن کر رہ گئے ہیں جو ہمارے ہر قول اور فعل کی بلا چوں و چرا تائید کرتے چلے جاتے ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں فاضل مصنف نے ایک نہایت ہی صحیح بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر دنیا انسانیت کے صحت مند اور عادلانہ نظام کی طالب ہے اور وہ اس ظلم و جور کو اس کائنات سے مٹا دینے کا عزم رکھتی ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ نہ صرف اچھے مقاصد سے محبت کرے، بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اچھے طریقے اختیار کیے جائیں۔

# مطبوعات

چراغِ راہ (کراچی) اسلامی قانون نمبر جلد اوّل و دوئم | مرتب: پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ قیمت جلد اوّل۔ چار روپے آٹھ آنے۔ صفحات ۳۵۴ قیمت جلد دوئم: تین روپے آٹھ آنے

صفحات۔ ۳۵۰۔ مقامِ اشاعت: دفتر چراغِ راہ، کراچی۔

اس ملک میں بعض اہم مراحل پر چراغِ راہ نے جو فکری اور علمی رہنمائی لوگوں کو دی ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اسی سلسلہ کی تازہ ترین پیش کش اسلامی قانون نمبر ہے۔ اس نمبر میں جو دو جلدوں پر مشتمل ہے تقریبًا وہ سارے مسائل آگئے ہیں جو اس ضمن میں سامنے آسکتے ہیں۔ اس نمبر کے لکھنے والوں میں اسلامی دنیا کی نامور شخصیتوں کے علاوہ بعض غیر مسلم اہلِ علم بھی شامل ہیں۔ کسی انسانی کوشش کو خواہ وہ کتنی ہی اچھی اور عمدہ ہو، آخری اور مکمل نہیں کہا جاسکتا یہی حال اس نمبر کا بھی ہے لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں اسلامی دستور پر کسی کتاب یا رسالہ میں آج تک اس قدر مواد جمع نہیں کیا گیا جتنا کہ اس میں موجود ہے۔ اس کامیاب کوشش کے لیے چراغ راہ کے اربابِ بست وکشاد اور خصوصًا اس کے نوجوان و فاضل مدیر جناب خورشید احمد بہت زیادہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مولانا مودودی اور تصوّف | مرتبہ مولانا ابو منظور شیخ احمد صاحب۔ ناشر: مکتبہ جہانِ نو سرگودھا۔

ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ طباعت کا معیار عمدہ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر جو مختلف اعتراضات وقتًا فوقتًا کیے گئے ہیں اُن میں ایک بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ مولانا تصوّف کے کوچہ سے تو بالکل واقف نہیں۔ لیکن اس کی مخالفت خواہ مخواہ کرنے لگے ہیں۔ چونکہ اس اعتراض کو پیش کرنے والوں میں بعض بڑی واجب الاحترام شخصیتیں بھی ہیں اس لیے ضروری تھا کہ اس اعتراض کا جائزہ لیا جاتا۔ اسی اہم ضرورت کے پیش نظر مولانا ابو منظور شیخ احمد صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر تصوف سے مراد

تزکیہ نفس ہے تو پھر مولانا بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح کہ کسی مسلمان کو ہونا چاہیے۔ یہ چیز تو اس کے دین وایمان کا عین تقاضا ہے اور اسی سے ایک مسلمان اپنے مالک اور خالق کے ساتھ اپنا تعلق استوار کرتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر اخلاص اور بے لوثی پیدا ہوتی ہے اور اسی راہ پر چل کر وہ صبر وثبات جیسی لازوال نعمت پاتا ہے۔ لیکن اگر تصوف سے مراد اشراقی، رواقی، زرتشتی اور ویدانی فلسفوں کا وہ ملغوبہ ہے جس میں مشرکانہ تخیلات اور اعمال تک خلط ملط ہو گئے ہوں تو اس تصوف کے مولانا نہ صرف قائل ہی نہیں بلکہ سخت مخالف ہیں اور اسے بیخ وبُن سے اکھاڑنا خدمتِ دین سمجھتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اس موضوع پر کامیاب کوشش ہے۔ انداز بیان بڑا سنجیدہ اور باوقار ہے۔ اگر کوئی شخص نیک نیتی سے مولانا مودودی کے اس موقف کو سمجھنا چاہے تو اس میں اُسے نہایت ہی قابلِ اطمینان مواد مل سکتا ہے۔

**اقبال کا سیاسی کارنامہ** ناشر: کاروانِ ادب کراچی۔ مصنف: محمد احمد خاں ایم۔ اے، ایل، ایل، بی قیمت چھ روپے صفحات ۵۲۳۔ طباعت کا معیار عمدہ۔

کسی مفکر، ادیب یا شاعر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کیا جائے۔ زندگی کا ہر پہلو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتا ہے کہ اگر اسے ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے تو انسان کی ساری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ہم کسی شخصیت کو جاننے کے لیے اُس کی زندگی کے سارے گوشوں پر نگاہ رکھیں۔

علامہ اقبال کی ذات کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ بعض حضرات نے خوب خوب دادِ تحقیق وتفہیم دی ہے لیکن علامہ مرحوم کی زندگی کا سیاسی پہلو ابھی گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے اگر اس طرف توجہ بھی کی تھی تو بڑی تشنہ اور نامکمل تھی۔ بعض حضرات نے تو صرف چند جملوں میں ہی علامہ کی سیاسی زندگی کی اہمیت کا ذکر کر کے چھوڑ دیا ہے۔ مرحوم کی زندگی کو مجموعی طور پر سمجھنے کے لیے اس چیز کی بڑی ضرورت تھی کہ ان کی سیاسی زندگی اور سیاسی

نظریات پر کما حقہٗ تفصیلی اور سیر حاصل بحث کی جائے۔ اس فریضہ کو جناب محمد احمد خاں صاحب نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ گو اس تصنیف کو اس موضوع پر حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا لیکن فی الحال اس نے بڑی حد تک ایک خلا کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے۔

فاضل مصنّف نے اقبال کے سیاسی رجحانات اور معتقدات کو ثابت کرنے کے لیے مرحوم کے خطوط سے خوب کام لیا ہے۔ کسی کے خیالات اور تصوّرات کو صحیح طریقے پر واضح اور ثابت کرنے کا اس سے زیادہ بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا۔ ان خطوط میں علامہ مرحوم نے خود اپنے ذہن کی صاف صاف ترجمانی کر دی ہے۔ علامہ کے بعض مخالفین کے الزامات کے جوابات بھی انہیں خطوط کے ذریعے سے مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ علامہ مرحوم کے ذہن میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کا جو نقشہ اُبھرا تھا اور جس طرح درجہ بدرجہ اس کو تقویت اور استحکام حاصل ہوا، اس کو بھی فاضل مصنّف نے ان خطوط کے ذریعے سے بڑی حد تک ثابت اور واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک خط میں علامہ نے قائد اعظم کو لکھا تھا: "اس ملک میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور اس کا ارتقاء ایک یا ایک سے زائد مسلم مملکتوں کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ کئی سال سے میرا یہ ایماندارانہ ایقان رہا ہے اور میں اب بھی مسلمانوں کے روٹی کے مسئلے کو حل کرنے اور ساتھ ہی ایک پُرامن ہندوستان حاصل کرنے کا اسی کو واحد طریقہ سمجھتا ہوں"

کتاب کی زبان بڑی سلجھی ہوئی، صاف اور سلیس ہے مصنّف نے اپنے مفہوم کو ہر جگہ بڑی صفائی سے ادا کیا ہے۔ اکثر مقامات پر ادبیت کی چاشنی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ بعض جگہوں پر یہ چیز کھٹکتی بھی ہے جہاں ادبیت کا اظہار کچھ مصنوعی رنگ اختیار کر گیا ہے۔ لیکن کتاب کی افادیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

---

خـــالی صفحـــه

# تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہء عمل

از

مولانا سید ابوالاعلی مودودی

یہ مولانا مودودی کی وہ تقریر ہے جو آپ نے فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں کی تھی - اس میں آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا سے آجتک کس پالیسی پر کام کرتی رہی ہے - کن کن مراحل سے گذر کر آئی ہے - تقسیم ہند سے قبل حالات کیا تھے - ان حالات میں جماعت کا طریق کار کیا تھا - تقسیم کے بعد حالات میں کیا تغیر رونما ہوا اور اسکے تقاضے کیا تھے - ایک لا دینی ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنے کے لئے جماعت کا فریضہ کیا تھا اور اس نے اسے کس حد تک انجام دیا - پیش نظر انقلاب اور اصلاح معاشرہ کی واحد صورت کیا ہے -

قیمت ۲-۱۲-۰ روپے

---

# تزکیہء نفس

از

مولانا امین احسن اصلاحی

* انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد کیا ہے ؟
* انسانی معاشرے کی فلاح اور انسان کی نجات اخروی کا انحصار کس چیز پر ہے ؟
* کیا ,,تزکیہ،، کا علم کوئی راز ہے ؟
* کیا ,,تزکیہ،، کا اصل موضوع انسان کی محض انفرادی زندگی ہے ؟
* علم حقیقی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟
* معرفت الہی کا صحیح مفہوم اور اسکے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے؟
* وہ کون سے عوامل ہیں جو معرفت الہی کے حصول میں حجاب اور سد راہ بنتے ہیں ؟

یہ جاننے کے لئے آپ مولانا اصلاحی کی تازہ کتاب تزکیہ نفس کا مطالعہ کیجئے

قیمت ۳-۸-۰ روپے

ملنے کا پتہ :

* مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور
* سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی - مسلم مسجد